مزید حماقتیں

شفیق الرحمٰن

مزید حماقتیں

شفیق الرحمٰن

۱۹۴۸

آپا ناز غنی کے نام-----

فہرست

دیباچہ

یہ دستور ہے کہ کتاب کہیں بھی لکھی گئی ہو مصنّف اگر ایک مرتبہ بھی ولایت گیا ہے تو دیباچہ ضرور لندن کا لکھا ہوا ہو گا۔ ان دنوں میں لندن میں ہوں اس لیے مجبور ہوں کہ اس روایت کو قائم رکھوں۔ ویسے میں کوئی خاص بات نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ یہ دیباچہ ہے جسے میں نے لندن میں لکھا۔

اگست ۵۳ء

شفیق الرحمٰن

۱۶-ہال روڈ

سینٹ جانزوُڈ

لندن

این ڈبلیو ۸

تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند

رقمزدہ: اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ، سابق شہنشاہ سابق ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر، سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ۔

پیش لفظ۔ عرف کرنا مرتّب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراقِ کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے، جنہیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحت ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی اِفترا پردازی کی ہے۔ کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگر چہ ہم مقامی مؤرخین کی لگام بندی فرما چکے تھے۔ تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رُخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں۔ ہمیشہ سے لوگوں کو

گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی جاتی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانبدار اور مُستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے۔ دراصل ہمیں اپنی دُور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منّت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوادیں۔ اور قتلِ عام؟ قتلِ عام کسی مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سالاٹھی چارج تھا، یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لاسکے، سُنا ہے ہمارے متعلّق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لیں ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمال ما بصورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دِل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے، یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا، اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کی بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رُخ نہ کرتے، اور اگر دِلّی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والئی کابل سے ناچاقی

مدّت سے ارادہ تھا کہ والئی کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر خواہ مخواہ پراپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اُگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پاکر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوّت کا غلط اندازہ تھا، ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے فرمانروا خان معروض ہُوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کے طرف آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھاڑتی تھی۔ بمشکل ہمیں نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوئے، تہیّہ کیا کہ جب تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خان کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند اُلّو دکھائی دیئے۔ یہاں کا اُلّو ایرانی اُلّو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ اُلّوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو لیا، شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا

لیتا اور رات بھر ہاؤ ہُو مچاتا۔ ہم نے فرمانبر دار خان سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے؟ وہ بولا گُستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبر دار خاں کو پاپوش مبارک سے زدو کوب کر کے سر فراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہُوا کہ فالِ نیک ہے۔ اُلّو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو اُلّو شناس کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزّت افزائی فرمائی۔

سیّاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی، جس نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچّے بچّے کی زبان پر ہیں۔ والئ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آکر منع کر دیا۔

شہباز خاں اُلّو شناس ہر روز ملکِ ہندوستان کی خبریں سُناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجّار، ہینگ، بھنگ، چرس و

دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو اُلّو شناس بھی چست ہو گیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی، جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سُنا تھا۔ نہ کبھی انہیں دیکھا تھا اور نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خان کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر، چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا کہ یہ بیکار وقت کیوں نہ سیّاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:

براہِ افغانستان: خیبر ایجنسی۔۔۔پشاور۔۔۔لاہور۔۔۔پانی پت۔۔۔دِلّی

براہِ بلوچستان: سمہ سٹہ۔۔۔بٹھنڈہ۔۔۔دِلّی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کُوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدینِ شہر فصیل تک بلکہ درۂ خیبر تک

چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے۔ والئی کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیّاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دِکھاوے کا ہے۔ یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پروپیگنڈا دوبارہ شروع کر دیں گے۔ اور پھر ہم اہلِ ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیّاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہو گا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اِس منزل سے کوچ کر کے درۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیّاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرند، چرند، درند، انسان بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتے۔ خداوند باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوج دار نے پشاور سے کچھ دُور آ کر سعادتِ آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہو گا کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں

دیتی۔ اس نے دو سو مُہر طلائی نذر کیں اور ایک مرصّع گھوڑا بطور پیش کش گزرانا۔ ہم نے بھی ازراہِ مروّت ایک دُنبہ عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگانِ درگاہ تو بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گُربہ کی مثال ہوتا ہے۔ نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے۔ کچھ دیر میں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہُوا کہ بھاگ نِکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا کوئی اور چیز تھیں۔ وَاللہُ اَعلَمُ بِالصَّوَاب۔

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ سیّد بایزید ابن یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں۔ جب بُلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہِ تلطّف اسے گلے سے لگالیا اور پیار سے بھینچا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً باہر لے گئے۔ لخلخہ سنگھایا گیا۔ مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفو چکر ہُوا۔ ہم نے اہل کاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوادے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوج دار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُر شوکت فیل جسم جانور ہے۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے۔ زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کی اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی۔ ڈرائیور علیٰحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

لطیفہ

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم اُن کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدّی کی پیشکش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کرلیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصّہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنہیں تعویذ کہتے ہیں۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ

لطیفہ سُن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اُڑائی ہے۔

لیکن جب اُلّو شناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہُوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہُوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہند آکر پیر بن جاتے اور مزے لُوٹتے۔

ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا۔ لیکن اُلّو شناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور بضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز!

اختر شماری

کل رات اختر شماری کی۔ دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آگئی۔ باقی بشرطِ زندگی کل گنیں گے۔

شُتر غمزے

مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شُتر غمزے ملاحظہ فرمائے، محظوظ ہوئے کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعہ دار نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ لیکن فوراً ہی پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ارادہ ہُوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں، لیکن اُلّو شناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دِلّی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آکر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہر گز نہ تھا۔ اُلّو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا۔ لیکن کچھ نہ ہُوا۔ تنگ آکر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔ اُلّو شناس چلا گیا اور جب شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ اُلّو شناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مُہریں دیں۔ ابھی گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے

حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلّقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے۔ اسے یہاں رشوت کہتے ہیں۔ کِس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران پہنچ کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مُہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں۔ باقی کوتوال کو دیں جس نے اپنا حصّہ لے کر بقیہ رقم قلعہ دار کے حوالے کی۔ قلعہ دار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیئے۔ واقعی یہ ملک عجوبۂ روزگار ہے۔

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوٹا شجر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار،

مبارک نفس، اور گوشہ نشین ہیں۔ گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدّنیا بنا جائے۔ پھر شُبہ سا ہُوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شُبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں اور پنجاب سے وادی کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ میں ہیرا پھیری کے زیادہ امکانات ہیں۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں، جنہیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدیدِ عہدِ شباب تھی۔

ہمارا سنجیدہ ہو جانا

گلستانِ بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پر حاضر ہُوا، ملتجی ہُوا کہ چلئے مشتاقانِ دیدِ راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے۔ ارادہ ہُوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر اُلّو شناس کو حسبِ معمول شُبہ ہُوا کہ یہ کوئی چال ہے۔ بیکانیر لق و دق صحرا ہے جس میں نہ پانی ہے نہ روئید گی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سُرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بُلوا کر الٹا لٹکوایا۔ جب بکا کہ واقعی یہ چال تھی، تو کھلوا کر سیدھا کیا۔ اس حادثے نے ہمارا

مُوڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہلِ ہند سے کسی اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ چنانچہ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے، اس نے یہ فہرست پیش کی:

1۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آورانِ ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔
2۔ ہندی گویّے ترانوں کو "نادر نادھیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔
3۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔
4۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔
5۔ یوں بھی ان دِنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصّہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصد ہُوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ بعد میں ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خان کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد آمد

شاہدرے کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی۔ نام بھی عبداللّطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ عبداللّطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدارِ لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے، گھمسان کا رن پڑا۔ گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشا دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رُخ بدلا۔ صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں بار بار ایک دوسرے سے کنّی کترا تی گزر جاتیں۔ گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں آخر کار صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروز پور۔ غلطی کا احساس ہُوا تو واپس لوٹے۔ اُلّو شناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروّجہ

کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست دینے کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد وقت وصول کیا۔ شام کو اُلّو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب تین ہزاری، سہ ہزاری اور دو ہزاری تھے۔ کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہُوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلّایا کہ وُہ ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درۂ خیبر سے آتے ہیں انہیں سیدھے دِلّی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب اور راوی عبور کر چکے تھے۔ ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے۔ سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ اہلِ ہند کا دستور ہے کہ حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے

میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہوں، معلوم ہُوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا: "ایں ایلچی بے معنی غرق مَے ناب اولیٰ" کسی طبلچی نے حافظؒ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اُسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دِلّی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہُوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہُوا تھا۔ اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا "یا شہنشاہ! سُنا ہے کہ آپ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلّق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھئے۔ اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔" ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہُوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے

سامان بندھوا رہے تھے کہ اُلّو شناس نے شُبہ کرا دیا کہ اہلِ ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفتاً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہُوا پھر حاضر ہُوا اور دِلّی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجیب ڈِھل مِل یقین لوگ ہیں۔ اُلّو شناس نے اصل وجہ بتائی جب درباری مذکور دِلّی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہُوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھُن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دِلّی دیکھ کر ہی جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رُتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقی ماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نزولِ اقبال دِلّی کے باہر ہُوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے۔ لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خاں نے عرض

کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔

بصد دقّت ہم اُوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ ستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہُوا تھا مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہُوا تھا۔ دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہُوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے؟ ہم نے پوچھا: ''ابے حملہ کیسا؟'' ایلچی نے عرض کیا ''خداوندِ نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہُوا تو سب کو سخت مایوسی ہو گی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا۔ اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والے۔۔۔۔''

''بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے۔'' ہم نے اسے ڈانٹا مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتّر بتّر ہو گئے۔ ہم شہر کے بڑے

دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ گھوڑے سے اتر کر بغل گیر ہوئے۔ اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دِلّی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سیّاحاں ہے۔ حمام گئے۔ الحمد للہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خورد و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہُوا ہو گا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کیا کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہو گا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصّے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباس شب خوابی، اور سلیپر بھیجے۔ چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر

سے تو سیدھا سادا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیوں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہُوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پا کر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومتِ ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا ہے۔

تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو بے حد اُنس ہو گیا ہے؟ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔ آپ اسے بخوشی لے جاسکتے ہیں۔“

ایسے خلوص و محبّت سے کسی کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوئے، تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دُکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”دِلّی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم

کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تا کہ اہلِ دِلّی کو مطلع کر دیا جائے، وہ اس کے لیے گھڑیاں گِن رہے ہیں۔"

"گھڑیاں کیوں گِن رہے ہیں؟ کیا وہ ہم جیسے مُشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں! آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں، جن کے متعلق کوئی اُستاد ذوق شعر کہیں گے۔" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریئے۔ بلکہ ایران کا دارالخلافہ دِلّی کو بنوا لیجیئے۔" عزیزی بڑی محبّت سے ملتمس ہُوا۔

"دیکھا جائے گا۔" ہم نے بھی محبّت سے فرمایا۔

وہ گُلقند والا قصّہ

بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئ دستر خوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ

فرمانبردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گُلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دِلّی دُور است

اس فقرے کو ہم نے اہلِ دِلّی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سُنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دِلّی دور تھی۔ جب لاہور پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعہ میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دِلّی دُور است اچھا بھئی چلو دِلّی دور است بس!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلّے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب بھی اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک

زبان بھی نہیں سکتیں۔ (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہُوا کرتا ہے)۔ درباری بیگمات بیحد ذہین ہیں۔ ایک بر جیس جہاں بیگم نے بر جس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا۔ دوسری نے ساڑھی کو شلوار سے ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا تعجّب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجالاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سنائی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے رنگین لباس پہنتا ہے۔ رجعت پسند ادب اور تنزّل پسند شاعری کا گرویدہ ہے۔ لیکن حرکتیں سب ترقّی پسند کرتا ہے۔

کل وزیرِ جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ اور حصّوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر کہنے لگا: "اب ملک کا بیشتر حصّہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گی اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاست ہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔"

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے تو سیدھے دِلّی آدھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے۔ ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے۔ کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسمِ بہار میں لال قلعہ میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیاء بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دِنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کیا۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم

بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو چند روز سمندِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردانہ مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے؟ بولا اس میں سوائے بادشاہ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا، مان گیا۔ ہمارا فرزند علی قلی خاں جو بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے، اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے بجائے عورتوں میں اُٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہُوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گُلبدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کر رہی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے۔ دیکھ کر آنکھوں میں خُون اُتر آیا (آج صُبح بھی ایک مرتبہ خُون اُترا تھا)۔ ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا ہمارے آٹو گراف لئے گئے۔ ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا۔ ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہُوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رُو نظر پڑی کہ کچھ سامان لئے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی۔ قلی!! قلی!! کیا دیکھتے ہیں کہ پِسر ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہُوا آیا اور اس کا سامان اُٹھالیا۔

"تم قلی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بالکل۔" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حِسّ مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حِس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے گی: "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں۔" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بُک کرالوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار

کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابّا مجھے گھُور رہے ہیں۔" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے۔ باز پُرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا؟ اس کے مُنہ سے نکل گیا کہ چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بُک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے؟ تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا" ہم نے گرج کر کہا۔ "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر۔"

"ابّا جان میں وعدہ کر چکا ہوں۔" اس نے ایسے عدم تشدّدانہ انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سُنی تھیں۔ چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبردار خان کو وقت پر سوجھتی نہیں)۔

عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا۔ وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے ایگری کلچر سُنا ہو گا۔ وہ البتّہ مشہور ہے۔ ہم مُصر ہوئے تو کہنے لگا آپ سُنی سُنائی باتوں کا یقین

نہ کیجیے۔ ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپّے چپّے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہو گا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرّس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص با غیرت معلوم ہوتا تھا چلّو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکّامِ شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلّو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق تو ہم کہہ نہیں سکتے البتّہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گُستاخی اور ہمارا تحمّل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قِصّہ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس کے کمرے میں گئے وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا: ”ابّا

جان! معاف فرمایئے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے۔"

ہمیں سخت غصّہ آیا۔ یہ نئ پود ہمیں آداب سکھائے گی۔ یہ لڑکا دِن بدِن بگڑ تا جا رہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے دیکھ رہے ہیں، جب سے دِلّی آیا ہے مُنہ چلتا رہتا ہے۔ کیا ہے تیرے مُنہ میں؟"

"پان کھا رہا ہوں۔ کسی نے دیا تھا۔" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہ عُرس والی لڑکی تو نہیں؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے۔" ہم نے فرمایا۔

"ابّا جان اس کی ٹھوڑی پر جو وہ خوشنما تِل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان ایک خوش نما تِل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں۔"

"ابّا جان محبّت بہت بُری چیز ہے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبّت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو

چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساڑیوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"ابّا جان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے۔۔۔اس سے۔۔۔۔"

"خبر دار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے؟"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا؟ شمشیر شاہ؟"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے، سمجھا؟"

"سمجھ گیا۔ ابّا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے؟ سرکس کے لیے؟"

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحبِ حضوری حقّہ بردار خاں معروض ہُوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبود کے لیے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ

ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تا کہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دُنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی:

1۔ درۂ خیبر کو ڈھا کر ہموار کر لیا جائے۔ وہاں سے دِلّی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالی شان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تا کہ حملہ آوروں کو کسی دقّت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

2۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس قطع کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

3۔ ہند کے تاریخی مقامات مُلک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیّاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے، غارہائے الورا، الورا میں، تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو مُنہدم کرا کے دِلّی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا

جائے تا کہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جاسکے۔

4۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

5۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تا کہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں اور تاریخِ ہند مرتّب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بیشمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں۔ مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں، جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

محبّت اور شادی کے متعلّق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبّت کو شادی سے اور شادی کو محبّت سے دُور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے

بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم بھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہُوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تُلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں۔ کیا یاد کرے گا۔ لیکن انہی دِنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مُرتکب ہوئے جو ہم جیسے بزرگ کی شان کے شایاں ہر گز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سُننے کے عادی نہیں ہیں۔ اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سُنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلّق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والد بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی ”شہزادوں کی تو خُدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔ ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے۔ بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔“

”ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں۔“ علی قُلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کِھل گئیں۔

”تمہارے کُنبے کے متعلّق امّی پوچھ رہی تھیں۔ تم مغل ہو؟“

”مغل وغیرہ کا تو پتہ نہیں ویسے ہم ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر ہوتے ہیں۔“ علی قلی

نے جواب دیا۔

”بہر حال ہمارے کُنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ علی قلی سے بھولپن سے کہا۔ ”شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہاں دیکھ لینا۔“

”ایران جانا تو ذرا مُشکل ہے کیونکہ امّی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آجایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ ابّا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرادیں۔“

”تجویز تو یہ بھی اچھی ہے۔“ وُہ ناخلف بولا۔ ”لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔“

علی قلی بگڑنے لگا۔ ”تم پرسوں شام کسی شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کی طرف گئی تھیں؟“

”وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے۔ تمہارے

ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے اور شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم بقیہ گفتگو سُنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے۔ بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نِرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی۔ یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں۔ سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں مئے رنگیں کی خوشبو ہوتی ہے۔ جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھِلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً چند گھونٹ بادہ رنگیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بوٹا شجرپوری کا نسخہ نکالا جو انہوں نے محبّت اُتارنے کے

سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اُسے دکھائی گئی۔ سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دُور بھاگنے لگا۔ دِلّی کا رخ ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدّنیا بننا چاہتا ہوں۔ ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوٹا شجر پوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ!

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سیّد برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے۔ اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گرانِ مملکتِ ہند" لکھا تھا۔ اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انہیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انہیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔

کاش! کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہُوا کہ "ان ہی کے دم سے تو دِلّی میں رونق ہے۔ للہ انہیں چھوڑ جایئے۔ گداگر البتہ حاضر ہیں۔"

"وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں۔" ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آ رہا ہے۔ آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے۔ یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا۔ معانقہ کیا۔ معلوم ہُوا کہ مُلک کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتا ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اُون تراشتا۔ آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اُسے مدعو کر کے اس کی عزّت افزائی فرمائی۔ اور اس حیرت انگیز ترقّی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقّع رہی ہے۔ مُلک اور قوم کی خدمت کر کے اس رُتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دَور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھُلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر

بکریوں کی اُون تراشنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہُوا۔ ایک روز شومئ قسمت سے کوئی خاص پوسٹر لگاتا ہُوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہُوا۔ رہائی کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سُننے میں ہمہ تن گوش تھا (جو خاک سمجھ میں نہیں آرہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی۔ گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر اپنے تئیں کھڑے پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہُوا جو کہ نہایت تسلّی بخش تھا۔ رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا۔ شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا۔ اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھُس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے کئی درجے بہتر تھا۔ چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق

شروع کر دی۔

خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ہم نے یہ سُنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے۔ زمانہ ساز خاں معروف ہُوا کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو اسی لائن پر ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ "علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔" وہ ملتمس ہُوا کہ "یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے۔" ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ "نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔"

ہمارا مقامی سیاست میں حصّہ لینا

ان دنوں ایک الیکشن زوروں پر تھا۔ اُلّو شناس معروض ہُوا کہ ہم دِلّی میں اِس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ خواہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا۔ کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد اُمّیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔

یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کُن خبریں سنائیں۔ جب ہم نے اس کو بُرا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہردلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا۔ تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیٰحدہ کیا۔ چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا۔ دو کمال درجہ ضدّی نکلے۔ ایک کو زدوکوب کرایا تو مانا۔ دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

رائے شماری شروع ہو گئی۔ حقّہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی۔ لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا۔ رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اُسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مُچ ہردلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو از حد پشیمان ہوئے۔ افسوس بھی ہُوا کہ ناحق ذرا سی خوشی وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہُوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش

ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے، سیاسی معاملات میں یہ لوگ بالکل سنجیدہ نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دِلّی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

اُلّو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کے بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک ریفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا۔ ”لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں۔ آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجئے یا بادشاہی مسجد۔“

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی۔ وہ بولا ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں، جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا۔ یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصّہ آیا لیکن فوراً اتر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصّہ ہی نہیں آتا۔ لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اُسی شام کو مِل گئی۔ اُلّو شناس بھاگا بھاگا آیا۔ بولا "محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات اِدھر اُدھر چھپا رہا ہے۔" ہم فوراً موقع پر پہنچے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے از راہِ مروّت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہُوا۔

ہندی وزراء سے شکر رنجی

اُلّو شناس اور محمد شاہ کے وزراء کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزراء کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ اُلّو شناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکادی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی۔ لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے۔ کہنے لگا۔

اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوائی جائے۔ ہم مان گئے۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابنِ شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں اس نے شکستہ حروف میں محض ''ایم، ایس، رنگیلا'' لکھا۔

اب کم بخت محرّر کہیں سے آمرا۔ معروض ہُوا کہ محاسب اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہُوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا۔ ڈاک خانے کا نہیں محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیئے۔ اس دفتری کاروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

''ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟'' ہم نے پوچھا۔

''وزیرستان سے۔'' وہ بولا۔

''اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟''

''یہ یونہی ہے۔''

ایک باکمال بزرگ

قطب الدّین خاں جاگیر دار کی شادی پر گئے۔ دولھا کی عجیب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے بُرا بھلا کہتی رہیں، پھر زدوکوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچا کہ شاید اَن بَن ہو گئی ہے۔ لیکن معلوم ہُوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولھا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروا دی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں۔ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نِکاح شروع ہُوا تو ذرا قریب آ گئے۔ جب دولھا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اُچھال کر "پھنس گیا" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ معلوم ہُوا کہ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصّوں سے خواتین آرائشی سامان

خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کِس نے اُڑادی تھی کہ یاتو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یابرخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔ لیکن ہم خواتین سے دُور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی خاں کو بھی دور دور رکھتے۔ ہم شادی برائے شادی کے ہر گز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دُور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دورانِ گفتگو ہمارے مُنہ سے غیر شعوری طور پر اُف، اُوئی اللہ، توبہ، ہائے، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نِکل جاتے جس سے بعد میں پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات کپڑوں اور ساس بہو کے قضیئوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اُٹھے۔ بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے ایک مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اُسے کوسنے دیئے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آجاتا۔ پھر فائل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی امراء نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا (ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی جو فرمانبردار خان کو یاد نہ رہی۔)

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے ایک وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انہیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دِلّی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے، اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انہوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تا کہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اُترواتے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدّت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقّی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقّی پسند خاتون کا قصّہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، محبّت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے۔ خاتون موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا۔

دربار میں اس نے ”نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی“ والی رُباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شُبہ ہُوا اور افواہیں اُڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر اُلّو شناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے، خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے:

ساٹھویں سال میں قدم آیا

زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا

آمد آمد ہوئی جوانی کی

غمزہ و ناز و دلستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے۔ دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے۔ لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبر دار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ و مایوس کُن جملے کہے۔ طیش میں آ کر اُسے درّے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبر دار خاں تو پہلے سے ہی درّانی ہے۔ چنانچہ اُسے معاف کیا اور اُلّو شناس کو بُلایا۔ وہ نمک خوار دست بستہ معروض ہُوا کہ روئے پُر نور پر وہ پُر ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھیں۔ لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلّی نہیں ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہُوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقّی یافتہ ہے۔ لہٰذا خاتونِ موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے۔ مسز محمد شاہ میں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دُور دُور رہنے لگے۔ خاتونِ مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

جامعۂ فرقانی

آج صبح مُلّا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے۔ آستاں بوسی کے لئے حاضر ہُوا اور ملتمس ہُوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزّت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچّے یہ کورس دس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلباء کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچّہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علّامہ کی سند ملتی ہے۔ کورس پورا کر لے تو علّامۃ الدّہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات، ابوالافضال، ابوالفضیلت عموماً سرکاری کاموں، جامعہ کے معلّمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیّاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علّامۃ الدّہر بناتا ہے۔ جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان

کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی اپنی ہوتی) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجّہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل صورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے دلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سُسرال والے انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے، تبھی اس ملک میں بیچاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی۔ حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مُلّا فرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:

حضرات کیسا روزِ سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات والا صفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دِلّی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب

واضح ہو چکا ہے۔ سُنا ہے کہ جناب خان صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیّت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں۔ شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل۔۔۔ خیر جانے دیجیئے۔۔۔۔ ان کی تقریر کو خاموشی سے سُنا جائے کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال۔۔۔ معاف کیجیئے۔۔۔۔ اچھا تو حضرات۔۔۔۔ مولٰینا نادر شاہ صاحب۔

ہم کو اس بدتمیز مُلّا پر سخت غصّہ آیا کہ ہمارے تیئں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولٰینا۔ ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔

ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا: "پیارے اطفال، معلّمین حضرات و پرنسپل مُلّا ایف اُللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزّت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے کہاں میسّر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اوّل تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں حالی پر تعجّب ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا

ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کارگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں گویا زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً

شیخ خُدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

یہ غلط ہے۔ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے۔

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے

حضرات و اطفال ہم ایران سے بڑی بڑی اُمّیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔ کابل میں آئے تو سوچا انہیں زد و کوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کُشتی لڑیں گے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک بااخلاق، وضع دار، نحیف و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور بزرگانِ سعادت سے لوگوں سے گپیں اُڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سُنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے۔ لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں۔ آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔ کئی سو سال پہلے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے۔ اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص

مہارت حاصل ہے۔ یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اُترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)۔ آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سُنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر تیسرا یا چوتھا شخص شعر کہتا ہے اور تخلّص کرتا ہے۔ یہ آب وہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر وشاعری کے لیے نہایت ساز گار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے۔ پچھلے ہفتے لال قلعہ میں چار پانچ آدمیوں کو قوّالی گاتے سُنا۔ وہ لوگ خوب سر دُھنتے اور وجد میں آکر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ دھر لیتے ہیں۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا مُنہ چڑاتا تھا۔ ہماری طرف عجیب وغریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض وغضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ پکّا راگ گا رہا ہے۔ سُنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں یہ صُبح صُبح ہر شخص بیزار ہوتا۔ غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یوں ہُوا کہ علی الصبح مسرور اُٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا اور رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ نے غمگین کر دیا۔ رات کو عبادت کا قصر کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں

شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچّوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی، مُلّا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی، ہم دیر تک بولتے رہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بد تمیز طلبہ کی جمائیوں اور خرّاٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات و جوابات

مُلّا فرقان نے اُٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”نادر شاہ صاحب سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کُھسر پُھسر ہونے لگی۔ ”کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟“ پوچھا گیا۔

”ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں۔“ ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے۔" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مُسکرا کر کہا "ہم خود شہنشاہ ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں۔ خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں؟" ایک برخوردار بولے۔

"ہاں۔" ہم نے فرمایا۔ "جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اُوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے۔"

"صاف صاف بتایئے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب؟"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مُسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مُسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا۔ "ہم شہباز خاں اُلّوشناس کی بائیں جانب ہیں اور مُلّا فرقان اللہ کی دائیں جانب۔"

"کیا آپ ایران سے آئے ہیں؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے "ہاں ہاں برخوردار اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمّل دکھایا تھا لیکن اس گستاخ سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خُون اُترنا شروع ہوا۔ میز پر ہمارا مکّہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ مُنہ کا جھاگ مُلّا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

نوازنا مُلّا فرقان اللہ کو

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی مُلّا کی شرارت ہے۔ پہلے ہمیں خفا کر کے ایک جلی بھنی تقریر کروانا۔ پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتا چلا کہ مُلّائی کا ڈھونگ ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد مُخبر بھیج کر پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خوردونوش پر نصف سے زیادہ اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بُلوا کر عزّت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صِلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کِس احمق نے شہر میں یہ اُڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اس سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں اُلّو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا، فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنہیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہُوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم چند ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے۔ مُفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انہیں ہر شام مقفّل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر

رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر، شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ ایسی کئی وارداتوں کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر اُن کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں۔ یہ کوئی اور کوئی ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دُور سے نادر شاہ مُردہ باد کے نعرے سُنائی دیئے۔ اسی وقت غیض و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے چند ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کر دو۔ یہ تھا وہ 'قتلِ عام' ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کر سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی ہم قمیض اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا۔ ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زدوکوب کیا تھا۔ اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے۔۔۔ کسے نہ ماند کہ دیگر بہ ناز کُشی۔

یہ شعر ہم نے پہلے سُن رکھا تھا۔ چنانچہ ہم نے مُسکرا کر دوسرا مصرع۔۔ مگر کہ زندہ کنی خلق راو بازکُشی۔ سُنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انہوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہے تھے۔ گرمی زیادہ تھی۔ ہمارا دِل بھی پسیج اُٹھا اور بغل گیر ہونے کی نیّت سے آگے بڑھے، لیکن بزرگ جلدی سے آداب بجالا کر چمپت ہوئے۔ خیر، اب تلوار کو میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہُوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہُوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرادی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہُوا ہے بلکہ ہُوا ہی نہیں، کیونکہ تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اِس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہُوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مِل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ عام بھی کرائیں جو امراء کے لیے ہو۔ پھر سوچا کہ اہلِ دِلّی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ تیمور کا قتلِ عام تین دن تین رات تک ہوتا رہا تھا۔ بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے۔ ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معانی کے خواستگار ہوئے۔ ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے۔ مُسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطّف انہیں بغل گیری سے سرفراز فرمایا۔ وہ فوراً بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتا نہیں کیوں؟ شاید ہماری بغل گیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے۔ انشاءاللہ۔ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیّت سے بیٹھے تھے۔ مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ اچانک ہم نے اپنے اُوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا۔ سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے۔ چنانچہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا۔ ہمارا دم گھُٹنے لگا۔ گستاخ آوازیں سُنیں تو معلوم ہُوا کہ کوئی شرارت ہے۔ ہڑبڑا کر اُٹھے اور دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا تھا کہ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر سعادت دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

واپسی کا قصد

ایک کباڑیے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبر دار خاں کی آنکھوں میں)۔ ہم بھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کُرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اب اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود بھی نہ پہن سکے، پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دِلّی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے؟ ہم موٹے ہو گئے ہیں۔ رات کو خرّاٹے لیتے ہیں۔ صبح کی چائے اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اُٹھتے۔ قیلولے کی عادتِ قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے۔ یہاں کی تیز دھوپ سے ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے۔ تاہم یہ پسندیدگی تسلّی بخش نہیں کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے چند باشندوں کو بھی دیکھ لیا تھا جن کے آباؤ اجداد بھی اچھے بھلے ہوں گے۔ اِدھر ملک میں عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں

ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا چنانچہ سیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ہمارا دِلّی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے از راہِ مروّت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بیشک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ ہمارے بغیر لال قلعہ خالی خالی سا لگے گا۔ یہ حقیقت تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی کافی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپِ نمرود پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ مُنہ چڑھا لیا ہے۔ تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والئی کابل سے نجات

والئی کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہُوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیئے جائیں ورنہ مروّت سے بعید ہو گا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ چند ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں، جن سے ہم مرتے دم تک جُدا نہیں ہو سکتے۔ البتّہ کچھ پوستینیں، دُنبے یا گُلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والئی کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونّق آدمی ہے، دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لَو لگانی چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بوٹا شجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستثنٰے ہو کر تارک الدّنیا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدّنیا کیوں نہیں ہو جاتے؟ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدّنیا ہو کر بھی دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا؟ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے دو تین سو سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب وہ ہند گیا بھی تو کِرکِری ہو گی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر از راہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈھے دُنبے، دو من گُلقند لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر،

نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوّا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیموں نچوڑ سے رہائی پائی۔

ختم شُد

(تتمہ)

ہمارا خِلد میں نزول

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ ہمیں چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا۔ اور ہمارا کام تمام کیا۔ اِنّا للہ و اِنّا اِلیہِ راجعون۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نِکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیتِ ایزدی ہر گز نہ تھی۔ اگر ہم فرمانبردار خان کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔۔۔

ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھئے آنجہانی بنتے ہیں یا خلدِ آشیانی یا کچھ اور۔ ویسے ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کُن افواہیں اُڑ رہی ہیں۔

یہ ریڈیو روم تھا

"کہاں سے آنا ہوا؟"

"سرزمینِ پاک سکاٹ لینڈ سے آ رہا ہوں، جہاں کے باشندوں کی دریا دِلی کے قصّے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔"

"کیسے آمد ہوئی؟"

"بذریعہ ریل آیا۔ ارادہ جہاز سے آنے کا تھا لیکن جہاز نکل چکا تھا۔ دراصل یہ آمد نہیں آورد تھی۔"

"ویسے روم کس سلسلے میں آنا ہوا؟"

"مثنوی مولٰینا روم سے متاثر ہُوا۔ اُدھر داناؤں سے سُن رکھا تھا کہ سب سڑکیں روم پہنچتی ہیں۔ چنانچہ ایک سڑک اختیار کی اور اپنے تیئں روم میں پایا۔ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔"

"کب تک قیام ہو گا؟"

"ارادہ تو چند روز ٹھہرنے کا تھا، لیکن اگر زیادہ تنگ کیا گیا تو شاید آج شام ہی کو ہجرت کر جاؤں۔"

"روم میں کیا کچھ کیا؟"

"وہی کیا جو رومن کرتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو اطالوی زبان کا، میں اطالیہ آ چکا لیکن زبان اب تک نہیں آئی۔ کچھ کام رومنوں کے اصرار پر کرنے پڑے۔"

"مثلاً"

"مثلاً ایک پارکر ۵۱ ایک ہزار لیرے میں خریدنا پڑا، حالانکہ اب ۵۲ ہے۔"

"یہ تو بہت سستا ملا۔ ہزار لیرے یعنی تقریباً گیارہ شلنگ۔"

"مگر وہ قلم صرف دِکھاوے کا ہے۔ لکھنے لکھانے سے منکر ہے۔"

"کچھ خرید و فروخت کی؟"

"خرید تو کی لیکن شکر ہے کہ ابھی فروخت تک نوبت نہیں پہنچی۔"

"آپ کو کرنسی کی سمجھ آ گئی؟ ایک پاؤنڈ کے سترہ سو لیرے ہوتے ہیں۔"

"مجھے تو یہ پتا ہے کہ چند ہی منٹوں میں نوٹوں کے لیرے لیرے ہو جاتے ہیں۔"

"روم میں آپ نے کیا کچھ دیکھا؟"

"وہی دیکھا جو گائیڈ نے دکھایا، گائیڈ جو کچھ دکھائے دیکھنا اور پسند کرنا پڑتا ہے۔ یوں بھی ہوا کہ گائیڈ دہنی طرف کے گُن گا رہا تھا لوگ بائیں طرف دیکھ رہے ہیں اور میں سامنے دیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے ابھی اور کیا کچھ دیکھنا ہے۔"

"آپ کو آرٹ کا شوق تو ہو گا؟"

"تھا۔۔۔ لیکن یہ معلوم کر کے بڑی مسرّت ہوئی کہ مائیکل اینجلو اور ڈاوَنچی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"یہ کیوں۔۔۔؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ پہلے ساری اٹلی میں صرف یہی دو حضرات رہتے تھے۔ ہر شہر ہر عمارت اور ملک کا ہر حصّہ انہی نے ترتیب دیا۔ فلارنس سارے کا سارا انہوں نے بنایا ہے۔ روم کا تہائی حصّہ، میلان کا نصف حصّہ اور بقیہ شہر ان کے شاگردوں نے بنائے ہیں۔ جن شہروں تک یہ نہیں پہنچ سکے اُنہیں بھی تعمیر کرنے کا قصد رکھتے تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی۔"

"کلیسائے پطرس دیکھا؟"

"پطرس صاحب آج کل روم میں ہیں کیا؟"

"جی نہیں سینٹ پیٹر کا گرجا۔"

"اچھا وہ تو انگریزی میں بتایئے نا۔۔ وہ تو آج صبح دیکھا تھا۔ بڑی اُونچی عمارت ہے۔ وہیں کسی زمانے میں مذہبی دیوانوں نے گنبد سے چھلانگ لگا کر خُودکُشی کا فیشن شروع کیا تھا۔ میرے خیال میں پہلے ان عقیدت مندوں نے بخشش کی دعائیں مانگی ہوں گی، جب خاطر خواہ جواب نہ ملا تو سوچا ہو گا کہ اب انتظار فضول ہے۔

وہ اُونچے اُونچے جنگلے بھی دیکھے جو اس رسم کو روکنے کے لیے اُوپر لگائے گئے ہیں۔ لیکن اب اگر کوئی ضرورت مند خُودکُشی کرنا چاہے بھی تو پہلے جیسی آسانی نہیں رہی۔ یہ کیسی دنیا ہے کہ انسان اطمینان سے خُودکُشی بھی نہیں کر سکتا۔ اتنے اونچے جنگلے نہیں ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ نوٹس لگا دیتے کہ یہاں خودکشی کرنا منع ہے۔۔"

"ہوں تو اور کہاں کہاں کی سیر کی؟"

"چڑیا گھر دیکھا، جہاں چڑیا کے علاوہ دیگر پرند تھے۔ پرندوں کے علاوہ جانور بھی تھے۔ اور یہ سب انسانوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ واٹیکن کے میوزیم میں ورجل اور دانتے کے مسوّدات دیکھے، جنہیں کاتب بڑی حفاظت سے واپس رکھا گیا تھا۔ وہاں کولمبس کا بنایا ہوا نقشہ بھی تھا جس میں یورپ تو ٹھیک طرح دکھایا ہے لیکن باقی دنیا کا حدود اربعہ کچھ عجب ہے۔ دراصل کولمبس کا عقیدہ تھا کہ جب تک انسان ایک ایک ملک کو خود دریافت نہ کر لے نقشہ بنانا فضول ہے۔"

"اور مائیکل انجیلو کا تراشا ہوا حضرت موسیٰ کا مجسمہ؟"

"خوب مجسمہ ہے! گائیڈ کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ اینجلو نے مجسمہ مکمل کر کے تھوڑی سے گھٹنے پر ضرب لگائی۔۔۔ مجسمے کے گھٹنے پر۔۔۔ اور نعرہ لگایا کہ بولتے کیوں نہیں تم ہی تو مکمل ترین موسیٰ ہو؟"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، اُن کی اس حرکت سے پتھر پر خواہ مخواہ نشان پڑ گیا۔"

"سیزروں کے روم کی سیر کی؟"

"جی ہاں پرانا روم دیکھا۔ وہ مقام جہاں سیزر کو قتل کیا گیا۔ جہاں مارک انطونی نے اپنی شہرۂ آفاق تقریر کی جسے شیکسپیئر نے سُن کر وہیں حرف بہ حرف نقل کر لیا۔ کولوزیم جو کولوسل ہے، جہاں انسان اور درندے آپس میں لڑا کرتے تھے۔ ویسے انسانوں اور حیوانوں میں لڑائی اب تک جاری ہے۔ سُنا ہے وہاں ایک قیدی نے شیر کے کان میں کچھ کہہ کر اپنی جان بچالی تھی۔"

"اُس نے کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ اگر آپ نے مجھے کھالیا تو ڈنر کے بعد مجمع کے سامنے آپ کو تقریر کرنی پڑے گی۔"

"مارکس آری لیٹس کا مجسمہ تو ضرور دیکھا ہو گا؟"

"جی ہاں! آپ نے تاثّرات مارکس آری لیئس پڑھی ہو گی؟ نہایت لاجواب کتاب ہے۔ سُنا ہے کہ آپ بڑے متّقی پرہیز گار خُداترس فلاسفر تھے۔ جب فرصت ملتی چند عیسائیوں کو شیروں کے سامنے ڈال کر کتاب لکھنی شروع کر دیتے۔ جب تحریریں بے جان اور پھیکی معلوم ہونے لگتیں تو چند اور عیسائیوں کو چند اور شیروں کے سامنے پھِنکوا کر جلدی سے پھر لکھنا شروع کر دیتے۔ آہ، پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ کولوزیم کے سامنے نیرو کے محل کے

کھنڈرات ہیں۔ گائیڈ نے بڑے وثوق سے بتایا کہ روم کو دیا سلائی دکھا کر وہ بھلا آدمی وائلن بجارہا تھا۔ گائیڈ کے لہجے سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی موقع پر موجود تھا۔ حالانکہ وائلن کا اس زمانے میں نام ونشان تک نہ تھا۔"

"نہیں صاحب! یہ بات تو ضرب المثل ہے۔ کیسے غلط ہو سکتی ہے؟"

"تو پھر ممکن ہے کہ بنسری بجارہا ہو یا نفیری، مگر وائلن ہر گز نہیں بجا سکتا۔"

"آپ نے برنینی کا وہ چشمہ دیکھا جہاں لوگ پانی میں سِکّے پھینک کر دُعا مانگتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ نے کیا مانگا؟"

"میں نے پانی میں سِکّہ پھینک کر کہا کہ کاش کہ میں یہاں پہلے آیا ہوتا۔"

"یہاں کی آب وہوا کے متعلّق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آب تو یہاں بوتلوں میں ملتا ہے جو سوڈے واٹر سے کسی طرح کم نہیں۔ ہوا میں سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ چنانچہ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ پر عمل پیرا ہونا سخت مشکل ہے۔"

"اور غذا؟"

"غذا میں غذائیت ضرورت سے زیادہ ہے اور باشندے ماشاء اللہ خوش خوراک ہیں"

"روم تک سفر کیسا رہا؟ بہت کچھ دیکھا ہو گا"

"راستے میں نظارے ایسے سہانے تھے کہ کچھ اور دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ PISA کے جھکے ہوئے مینار کو دیکھ کر افسوس تو ہُوا مگر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ کششِ ثقل کے متعلق جو شبہات تھے وہ اور قوّی ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے مینار اب گرا، اب گرا، دن بھر میں وہاں رہا لیکن مینار گرا نہیں۔"

"ماہرین نے مینار پر کتابیں لکھی ہیں۔"

"ماہرین تو ہمیشہ بتنگڑ میں بات پیدا کرتے ہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے معمار ناتجربہ کار تھے۔ کسی نے دل لگا کر کام نہیں کیا۔ ٹھیکیدار نے پتھّر اور مسالہ بھی گھٹیا کو الٹی کا لگایا۔ ورنہ دِلّی میں قطب صاحب کی لاٹھ اس سے کہیں بلند ہے اور بالکل جوں کی توں ہے۔ کششِ ثقل بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔"

"اٹلی آنے سے پہلے آپ نے کہاں کہاں کی سیر کی؟"

"سوئٹزر لینڈ اور فرانس کی۔ NICE میں پھولوں کی جنگ میں شمولیت کی۔ لوگوں نے پھول مار مار کر ایک دوسرے کا بھرُکس نکال دیا۔ یہ حالت ہوئی کہ اگلے دن سڑکوں پر چلنا محال تھا۔"

"اور مانٹی کارلو۔۔۔؟"

"پیشتر اس کے کہ آپ وہاں کے قمار خانے کے متعلّق پوچھیں، میں یہ بتادوں کہ میں وہاں صرف عبرت حاصل کرنے گیا تھا۔"

"پیرس کیسا لگا؟"

"پتہ نہیں پیرس کے مضافات میں مجھے گوجرانوالہ اور خان پور کیوں یاد آئے۔ لوگ تہمد نما چیزیں باندھے موڑھوں پر بیٹھے حقّہ سا پی رہے تھے۔ لیکن پیرس بہت مہنگا ہے۔ ایک تو وہاں بخششیں بہت مانگتے ہیں۔ بات بات پر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور تب تک ٹکٹکی باندھے مُسکراتے رہتے ہیں جب تک آپ کم از کم تین سو فرانک نہ دے دیں ورنہ تعاقب کرتے ہیں۔ صحیح معنوں میں تعاقب کرنا ایک فرانسیسی ہی جانتا ہے۔ راستہ پوچھو تب بخشش، کسی چیز کی تعریف کرو تب بخشش، یہاں تک کہ صبح بخیر یا شب بخیر کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

"فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں سے آپ کو کون سا ملک پسند آیا؟"

"ان تینوں میں سے مجھے سپین پسند ہے۔"

"وہاں کیا ہے۔۔۔؟"

"سپین ہی وہ ملک ہے جہاں گھر یاد نہیں آتا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کو اَل مُرضا کہتے ہیں جو غالباً اَل مُرغا سے نکلا ہے۔ سلاد کو اَل سلادا، گیراج کو اَل گیراجو اور بھینس کو اَل بفیلو۔۔ جہاں اَل فانسو نام کے بادشاہ گزرے ہیں۔ جہاں مغربی کھانوں کے ساتھ پلاؤ بھی کھایا جاتا ہے اور بازاروں میں حلوہ کھلم کھلّا بِکتا ہے۔ جہاں لوگ قیلولہ کرتے ہیں۔ گھروں میں زنانہ اور مردانہ علیٰحدہ علیٰحدہ ہے۔ جہاں کی موسیقی مشرقی ہے۔ جہاں خانہ بدوش گٹار کی دُھن پر والہانہ رقص کرتے ہیں۔ جہاں بال اور آنکھیں سیاہ اور دل سفید ہیں، اگرچہ رنگت گندمی ہے۔ اور شہروں کے نام جانے پہچانے سے ہیں۔ ریاضہ، الکنیز، قرطبہ، طلیطلہ، القنطرۃ، غرناطہ، ظفرہ۔ اشبیلیہ۔ جہاں رات گئے لوگ ہار پہن کر پیچیدہ گلیوں میں سیر کرتے ہیں۔ اور محبوب کے کوچے میں بلند آواز سے اشعار بھی پڑھ ڈالتے ہیں۔ اور

آج بھی اُس دیس میں عام ہے چشمِ غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں"

"ہے ہے یہ آپ نے کیا یاد دلا دیا۔ کاش کہ ہم روم میں سپین کی باتیں نہ کریں۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی تو باہر نکل کر ایک سگریٹ پیوں گا۔"

"میرا مطلب ہے روم سے کہاں جائے گا؟"

"کیٹس اور شیلے کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے بعد یہ دریافت کر کے کہ روم کتنے دنوں میں بنا تھا، نیپلز ایک اطالوی دوست سے ملنے جاؤں گا۔ وہ جنگ کے دوران میں قیدی تھا اور میرا مریض تھا۔ مریض اور طبیب رہ چکنے کے بعد باوجود ہمارے تعلّقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔"

"آپ کو کوئی دلچسپ ہم سفر بھی تو ملے ہوں گے؟"

"جی ہاں جنیوا میں دو اطالوی لڑکیاں ملِیں جن کا دو فرانسیسی تعاقب کر رہے تھے۔ مانٹی کارلو میں دو فرانسیسی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی، جو دو اطالوی لڑکوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اب میں کچھ ایسے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو ایک دوسرے کا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔ اگر اجازت ہو تو ایک سوال پوچھوں؟"

"ارشاد"

"ابھی اور کتنی دیر ہے؟"

"تقریباً دو منٹ۔"

"میرے خیال میں اب ایک فلمی گانا ہو جائے۔۔ کوئی نیا ریکارڈ ہے۔ آپ کے پاس؟"

"جی ہاں۔۔۔ 'تیری لونگ دا پیا لشکارا' پچھلے مہینے وطن سے آیا ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ شائقین کو زیادہ مت ترسایئے۔"

"بہت اچھا۔۔ خدا حافظ۔"

"فی امان اللہ!"

کلیدِ کامیابی

(حصّہ دوم)

ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیونکہ ایک حیرت انگیز دور سے گزر رہے ہیں۔ آج تک انسان کو ترقّی کرنے کے اتنے موقعے میسّر نہیں ہوئے۔ پرانے زمانے میں ہر ایک کو ہر چیز خود سیکھنا پڑتی تھا لیکن آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تُلا ہُوا ہے اور دوسروں کو شاہراہ کامیابی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ اگر آپ کی مالی حالت مخدوش ہے تو فوراً لاکھوں کماؤ خرید لیجئے۔ اگر مقدمہ بازی میں مشغول ہیں تو رہنمائے قانون لے آیئے۔ اگر بیمار ہیں تو گھر کا طبیب پڑھنے سے شفا یقینی ہے۔ اسی طرح کامیاب زندگی، کامیاب مرغی خانہ، ریڈیو کی کتاب، کلیدِ کامیابی، کلیدِ مویشیاں اور دوسری لاتعداد کتابیں بنی نوع انسان کی جو خدمت کر رہی ہیں اس سے ہم واقف ہیں۔

مصنّف اِن کتابوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ ازراہِ تشکّر کلیدِ کامیابی حصّہ دوم لکھنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ چند نکتے جو اس افادی ادب میں پہلے شامل نہ ہو سکے اب شریک کر لیے جائیں۔

عظمت کا راز

تاریخ دیکھئے، دنیا کے عظیم ترین انسان غمگین رہتے تھے۔ کارلائل کا ہاضمہ خراب رہتا تھا۔ سیزر کو مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ روس کا مشہور آئی وَن نیم پاگل تھا۔ خودکشی کی کوشش کرنا کلائیو کا محبوب مشغلہ تھا۔ کانٹ کو یہ غم لے بیٹھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یورپ کی کلاسیکی موسیقی بیمار اور بیزار فن کاروں کی مرہونِ منّت ہے۔ دنیا کا عظیم ادب مغموم موڑ کی تخلیق ہے اور اکثر جیلوں میں لکھا گیا ہے۔ لہٰذا غمگین ہوئے بغیر کوئی عظیم کام کرنا ناممکن ہے۔ غم ہی عظمت کا راز ہے۔۔ یا غم آسرا تیرا۔

تو پھر آج ہی سے رنجیدہ رہنا شروع کر دیجئے۔ بہت تھوڑے ملک ایسے ہیں جہاں غمگین ہونے کے اتنے مواقع میسّر ہیں جتنے ہمارے ہاں۔ ابھی چند اشعار پڑھیے۔ ہماری شاعری ماشاء اللہ حزن والم سے بھرپور ہے۔ سوچیے کہ زندگی پیاز کی طرح ہے۔ چھیلتے رہیے اندر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ رشتہ داروں اور

ان کے طعنوں کو یاد کیجیے۔ پڑوسی عنقریب آپ کے متعلق نئی افواہیں اُڑانے والے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ سے قرض لیا ہے ایک پائی بھی ادا نہیں کی (ویسے جو قرض آپ نے لیا ہے وہ بھی ادا نہیں ہوا)۔۔۔ زندگی کتنی مختصر ہے۔۔۔۔ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ شام کی گاڑی سے کوئی بیس رشتہ دار بغیر اطلاع دیئے آ جائیں گے۔ ان کے لیے بستروں کا انتظام کرنا ہو گا۔ یہ چشتی صاحب اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ پچھلے ہفتے قطب الدّین صاحب نے کھانے پر سارے شہر کو مدعو کیا۔ سوائے آپ کے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ غمگین ہیں۔ آہیں بھریے۔ ماتھے پر شکنیں پیدا کیجیے۔ ہر ایک سے لڑیئے۔ عنقریب آپ اس احساسِ برتری سے آشنا ہوں گے جو سدا بیزار رہنے والوں کا ہی حصّہ ہے۔ وہ احساس جو انسان کو نطشے کا فوق الانسان بناتا ہے۔ اب آپ شاید کوئی عظیم کام کرنے والے ہیں۔

عظیم کام کر چُکنے کے بعد اگر موڈ بدلنا منظور ہو تو فوراً بازار سے 'مسرور رہو'، 'مُسکراتے رہیے'، یا ایسی ہی کوئی کتاب لے کر پڑھیے اور خوش ہو جایئے۔

اپنے آپ کو پہچانو

حکماء کا اصرار ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو۔ لیکن تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اپنے آپ کو کبھی مت پہچانو ورنہ سخت مایوسی ہو گی۔ بلکہ ہو سکے تو دوسروں کو بھی مت پہچانو۔ ایمرسن فرماتے ہیں کہ "انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی بنتا ہے۔"

کچھ بننا کس قدر آسان ہے۔ کچھ سوچنا شروع کر دو اور بن جاؤ۔ اگر نہ بن سکو تو ایمرسن صاحب سے پوچھو۔

خواب اور عمل

اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنائیے۔ یہ جامہ جتنا جلد پہنایا گیا اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ان لوگوں سے بھی مشورہ کیجئے جو اس قسم کے جامے اکثر پہناتے رہتے ہیں۔

حافظہ تیز کرنا

اگر آپ کو باتیں بھول جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہے۔ فقط آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں۔ علاج بہت آسان ہے۔ آئندہ باتیں یاد رکھنے کی کوشش ہی مت کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کچھ باتیں آپ کو ضرور یاد رہیں گی۔

بہت سے لوگ بار بار کہا کرتے ہیں۔۔۔ہائے یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا؟ اِس سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ پہلے سے سوچ کر رکھیے اور یا پھر اپنے لوگوں سے دُور رہیے۔ دانشمندوں نے مشاہدہ تیز کرنے کے طریقے بتائے ہیں کہ پہلے پھرُتی سے کچھ دیکھئے، پھر فہرست بنایئے کہ ابھی آپ نے کیا کیا دیکھا تھا۔ اس طرح حافظے کی ٹریننگ ہو جائے گی اور آپ حافظ بنتے جائیں گے۔ لہٰذا اگر اور کوئی کام نہ ہو تو آج سے جیب میں کاغذ اور پنسل رکھیے۔ چیزوں کی فہرست اور فہرست کو چیزوں سے ملایا کیجئے۔۔۔بڑی فرحت حاصل ہو گی۔

شوپنہار سیر پر جاتے وقت اپنی چھڑی سے درختوں کو چھُوا کرتا تھا۔ ایک روز اُسے یاد آیا کہ پُل کے پاس جو لمبا سا درخت ہے اُسے نہیں چھُوا۔ وہ مردِ عاقل ایک میل واپس گیا اور جب تک درخت نہ چھُو لیا اُسے سکونِ قلب حاصل نہ ہوا۔

شوپنہار کے نقشِ قدم پر چلئے۔ اس سے آپ کا مشاہدہ اس قدر تیز ہو گا کہ آپ اور سب حیران رہ جائیں گے۔

خوف سے مقابلہ

دل ہی دل میں خوف سے جنگ کرنا بے سُود ہے۔ کیونکہ ڈرنے کی ٹریننگ ہمیں بچپن سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھوت، چڑیل، ہاؤ اور دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے تو تاریکی میں جائیے ہی مت۔ اگر اندھیرا ہو جائے تو جلدی سے ڈر کر روشنی کی طرف چلے آیئے۔ آہستہ آہستہ آپ کو عادت پڑ جائے گی اور خوف کھانا پرانی عادت ہو جائے گی۔

تنہائی سے خوف آتا ہو تو لوگوں سے ملتے رہا کیجئے۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈریئے ورنہ یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس وقت آپ دراصل کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔

وقت کی پابندی

تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اگر آپ وقت پر پہنچ جائیں تو ہمیشہ دوسروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اکثر دیر سے آتے ہیں۔ چنانچہ خود بھی ذرا دیر سے جایئے۔ اگر آپ وقت پر پہنچے تو دوسرے سمجھیں گے کہ آپ کی گھڑی آگے ہے۔

وہم کا علاج

اگر آپ کو یونہی وہم سا ہو گیا ہے کہ آپ تندرست ہیں تو کسی طبیب سے ملیے۔

یہ وہم فوراً دور ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ کسی وہمی بیماری میں مبتلا ہیں تو ہر روز اپنے آپ سے کہیئے۔۔۔ میری صحت اچھّی ہو رہی ہے۔ میں تندرست ہو رہا ہوں۔

احساسِ کمتری ہو تو بار بار مندرجہ ذیل فقرے کہے جائیں:

میں قابل ہوں۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں۔ جو کچھ میں نے اپنے متعلق سُنا سب جھوٹ ہے۔ میں بہت بڑا آدمی ہوں۔ (یہ فقرے زور زور سے کہے جائیں تاکہ پڑوسی بھی سُن لیں)۔

بے خوابی سے نجات

اگر نیند نہ آتی ہو تو سونے کی کوشش مت کیجئے۔ بلکہ بڑے انہماک سے فلاسفی کی کسی موٹی سی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیجئے۔ فوراً نیند آ جائے گی۔ مجرّب نسخہ ہے۔ (ریاضی کی کتاب کا مطالعہ بھی مفید ہے۔)

ہمیشہ جوان رہنے کا راز

اوّل تو یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ جوان رہنا کوئی بہت بڑی بات ہے۔ اس عمر کے

نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ ملاحظہ ہو وہ شعر:

خیر سے موسم شباب کٹا

چلو اچھا ہوا عذاب کٹا

تاہم اگر آپ نے ہمیشہ جوان رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو بس خواہ مخواہ یقین کر لیجئے کہ آپ سدا جوان رہیں گے۔ آپ کے ہم عمر بیشک بوڑھے ہو جائیں، لیکن آپ پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ جوانوں کی سی حرکتیں کیجئے۔ نوجوانوں میں اُٹھئے بیٹھئے۔ اپنے ہم عمر بوڑھوں پر پھبتیاں کسئیے۔ خضاب کا استعمال جاری رکھئے اور حکیموں کے اشتہاروں کا بغور مطالعہ کیجئے۔

دلیر بننے کا طریقہ

دوسرے تیسرے روز چڑیا گھر جا کر شیر اور دیگر جانوروں سے آنکھیں ملایئے (لیکن پنجرے کے زیادہ قریب مت جایئے)۔ بندوق خرید کر انگیٹھی پر رکھ لیجئے اور لوگوں کو سُنایئے کہ کس طرح آپ نے پچھلے مہینے ایک چیتا یا ریچھ (یا دونوں) مارے تھے۔ بار بار سُنا کر آپ خود یقین کرنے لگیں گے کہ واقعی آپ نے کچھ مارا تھا۔

ویسے خان بہادر بننے سے بھی کافی فرق پڑ جاتا ہے۔

بیروزگاری سے بچیئے

اگر آپ بے روزگار ہیں تو فوراً ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں درخواست دے کر کسی کھاتے پیتے رشتہ دار کے ہاں انتظار کیجئے۔ اور یہ یاد رکھئے کہ انتظار زندگی کا بہترین حصّہ ہے۔

ایک خانگی مشورہ

اگر آپ بیوی ہیں۔ آپ کا خاوند تھکا ماندہ دفتر سے آتا ہے۔ آپ مُسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں اور اچھی اچھی باتیں سُناتی ہیں تو شام کو وہ ضرور کہیں اِدھر اُدھر چلا جائے گا۔ لیکن اگر آتے ہی آپ نے اُسے بے بھاؤ کی سُنا دیں۔ بات بات پر لڑیں اور پریشان کُن تذکرے چھیڑ دیں تو وہ منانے کی کوشش کرے گا اور شام گھر میں گزارے گا۔ اگر کہیں باہر گیا تو ساتھ لے جائے گا۔ (مگر یہ عمل بار بار نہ دہرایا جائے ورنہ کہیں شوہر موصوف واپس گھر کا رُخ ہی نہ کرے)۔

ایک کہانی

یا تو لوگ تقدیر کو کوستے ہیں یا تدبیر کو۔ یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ مشہور ہے۔ کہ پہاڑوں میں پارس پتھر ہوتا ہے۔ جو چیز اسے چھُو جائے سونا بن جاتی ہے۔

ایک شخص نے چھ مہینے کی چھُٹّی بغیر تنخواہ کے لی اور قسمت آزمائی کرنے نیپال پہنچا۔ کرائے کے جانوروں کے پاؤں میں زنجیریں باندھیں کہ شاید کوئی زنجیر پارس پتھر سے چھُو جائے۔ دن بھر اُنہیں جنگلوں میں لئے لئے پھرتا۔ دن گزرتے گئے اور کچھ نہ بنا۔ آخر چھُٹّی ختم ہوئی۔ جانور اور زنجیریں لوٹا کر قسمت کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ جوتا اُتارتے وقت معلوم ہوا کہ میخیں سونے کی بن چکی ہیں۔ سُنار کے پاس گیا اس نے میخیں تول کر قیمت بتائی۔۔۔ یہ پورے چھ مہینے کی تنخواہ تھی۔

اس سے نتائج خود نکالئے۔ لیکن تقدیر اور تدبیر پر لعنت ملامت نہ کیجئے اور قسمت آزمائی کے لیے پہاڑوں کی طرف مت جایئے۔

گفتگو کا آرٹ

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہئے۔ دورانِ گفتگو میں خاموش رہنے کی صرف ایک

وجہ ہونی چاہیے وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ ورنہ جتنی دیر جی چاہے، باتیں کیجیے۔ اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگے گا (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ چاہتے ہوں کہ وہ سُنے) چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رُکیے، تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیں کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجیے۔ اگر کوئی دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا تو بیشک جمائیاں لیجیے۔ کھانسیے۔ بار بار گھڑی دیکھیے۔۔ میں ابھی آیا۔۔۔ کہہ کر باہر چلے جایئے یا وہیں سو جایئے۔

یہ غلط ہے کہ آپ بحث نہیں جیت سکتے۔ اگر آپ ہار گئے تو مخالف کو آپ کی ذہانت پر شُبہ ہو جائے گا۔ مجلسی تکلّفات بہتر ہیں یا اپنی ذہانت پر شُبہ۔۔

البتہ لڑیئے مت، اس سے بحث میں خلل آ سکتا ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے کبھی مت مانیئے۔ لوگ ٹوکیں تو اُلٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے اُنہیں خاموش کرا دیجیے ورنہ وہ خواہ مخواہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ دورانِ گفتگو میں لفظ ”آپ“ کا استعمال دو یا تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اصل چیز ”میں“ ہے۔ اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو

دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔

تعریفی جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجئے۔ کبھی کسی کی تعریف مت کیجئے۔ ورنہ سننے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ آپ اُسے کسی کام کے لیے کہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کچھ پوچھنا مطلوب ہو جسے وہ چھُپا رہا ہو تو بار بار اُس کی بات کاٹ کر اُسے چڑا دیجئے۔ وکیل اسی طرح مقدمے جیتتے ہیں۔

دوسروں کو متاثر کرنا

اگر آپ ہر شخص سے اچھی طرح پیش آئے۔ ہاتھ دبا کر مصافحہ کیا، قریب بیٹھے اور گرمجوشی سے باتیں کیں۔ تو نتائج نہایت پریشان کن ہوں گے۔ وہ خواہ مخواہ متاثر ہو جائے گا۔ اور نہ صرف دوبارہ ملنا چاہے گا بلکہ دوسروں سے تعارف کرا دے گا۔ یہ تیسروں سے ملائیں گے۔ چنانچہ اتنے ملاقاتی اور واقف کار اکٹھے ہو جائیں گے کہ آپ چھپتے پھریں گے۔

ممکن ہے کہ لوگ متاثر ہو کر آپ کو بھی متاثر کرنا چاہیں۔ بلا ضرورت بغلگیر ہوں گے۔ ہاتھ دبائیں گے اور قریب بیٹھنے کی کوشش کریں گے۔

لہٰذا کسی کو متاثر کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ بالفرض اگر آپ کسی کو متاثر کر

رہے ہوں تو خیال رکھئے کہ آپ اور اس شخص کے درمیان کم از کم تین گز کا فاصلہ ہو ورنہ وہ متاثر ہوتے ہی آپ سے بغلگیر ہونے کی کوشش کرے گا۔ (ہو سکتا ہے کہ کہیں آپ بھی اس سے متاثر نہ ہو جائیں)۔ زندگی پہلے ہی کافی پیچیدہ ہے۔

کبھی مت کہیئے کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" بلکہ اُس سے پوچھئے کہ کہیں وہ تو آپ سے مل کر خوش نہیں ہو رہا۔ اگر یہ بات ہے تو خبر دار رہیے۔

رشتہ داروں سے تعلقات

دُور کے رشتہ دار سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ جتنے دور ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دور کے رشتے دار سہانے۔

تربیتِ اطفال

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آئے۔ بچّے سوال پوچھیں تو جواب دیجئے مگر اس انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجئے جب بڑے ہو گئے سب پتہ چل جائے گا۔

بچّوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیے۔ شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں۔ بچّوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجئے۔ کورس کی کتابیں کافی ہیں۔

اگر بچّے بے وقوف ہیں تو پروانہ کیجئے۔ بڑے ہو کر یا تو جینئیس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینئیس سمجھنے لگیں گے۔ بچّے کو سب کے سامنے کبھی مت ڈانٹئے، اس کے تحت الشُعور پر بُرا اثر پڑے گا۔ ایک طرف لے جا کر اس کی خوب تواضع کیجئے۔

بچّوں کو پالتے وقت احتیاط کیجئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں۔۔ ورنہ وہ بہت موٹے ہو جائیں گے اور والدین اور پبلک کے لیے خطرے کا باعث ہوں گے۔

اگر بچّے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجئے۔ وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔

ماہرین کا اصرار ہے کہ موزوں تربیت کے لیے بچّوں کا تجزیۂ نفسی کرانا ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے والدین اور ماہرین کا تجزیۂ نفسی کرا لینا زیادہ مناسب ہو گا۔ دیکھا گیا ہے کہ کُنبے میں صرف دو تین بچّے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا بچّے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہئیں تا کہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔

اسی طرح آخری بچّہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آخری بچّہ نہیں ہونا چاہیے۔

مردوں کے لیے دُبلا ہونے کا طریقہ

ملاحظہ ہو ''عظمت کا راز''

خواتین کے لیے دُبلا ہونے کی ترکیب

آج سے مندرجہ ذیل پرہیزی غذا شروع کر دیجیے۔

ناشتے پر۔۔۔ ایک اُبلا ہوا انڈا۔ بغیر دُودھ اور شکر کے چاء۔

دوپہر کو۔۔۔ اُبلی ہوئی سبزی، بغیر شوربے کا تھوڑا سا گوشت، ایک چپاتی۔

سہ پہر کو۔۔۔ ایک بسکٹ۔ بغیر دُودھ اور شکر کی چاء۔

رات کو۔۔۔ اُبلا ہوا گوشت، سبزی۔ ڈیڑھ چپاتی۔ پھل۔ بغیر دُودھ اور شکر کی کافی۔

(اس پرہیزی غذا کے علاوہ ساتھ ساتھ باورچی خانے میں نمک چکھنے کے سلسلے میں پلاؤ، مُرغّن سالن اور پراٹھے۔ میٹھا چکھتے وقت حلوہ کھیر اور فرنی۔ ''یہ بلّی تو

نہیں تھی" کے بہانے بالائی دُودھ اور مکھن۔ "دکھاتو سہی تو کیا کھا رہا ہے" کے بہانے بچّوں کے چاکلیٹ اور مٹھائیاں)۔

بعض اوقات اس پرہیزی غذا کا اثر نہیں ہوتا۔ تعجّب ہے؟

مردوں کے لیے موٹا ہونے کا نسخہ

بھینس رکھنا، دفتر کی ملازمت، دوپہر کے کھانے کے بعد دہی کی لسّی اور قیلولہ۔ سارے کھیل چھوڑ کر صرف شطرنج اور تاش کھیلئے اور اگر آؤٹ ڈور گیم ہی کھیلنا ہو تو بیڈمنٹن کھیلئے، بس۔

خواتین کے موٹا ہونے کی ترکیب

کسی خاص ترکیب کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تعجّب ہے کہ ایسے اہم موضوع پر اس قدر کم لکھا گیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ماہرین تسخیرِ حُب سب کچھ صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی اس قسم کے اشتہار چھپتے ہیں

محبّت کے ماروں کو مژدہ!

محبوب ایک ہفتے کے اندر اندر قدموں میں نہ لوٹنے لگے تو دام واپس!

اس کے علاوہ امتحان میں کامیابی، اولاد کی طرف سے خوشی، خطرناک بیماریوں سے شفا، مقدمہ جیتنا، تلاشِ معاش، افسر کو خوش کرنے کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ اشتہار میں ایک مونچھوں والے (یا داڑھی والے) چہرے کی تصویر، کئی سندیں اور سرٹیفکیٹ بھی ہوتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں نہ کتابوں میں کچھ موجود ہے نہ رسائل میں۔ ادھر ہمارے ملک میں تسخیرِ حُب کی قدم قدم پر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہر شخص اس چشمہ حیواں کی تلاش میں ہے۔ اگرچہ مصنّف کی معلومات اس موضوع پر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تاہم اس نے دوسروں کے تجربوں سے چند مفید باتیں اخذ کی ہیں۔

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ چاہنے والا مرد ہے یا عورت۔ اور اُدھر محبوب کا تعلق کسی جنس سے ہے؟ لہٰذا سہولت کے لئے ان ہدایات کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

یعنی

1۔ اگر محبوب عورت ہے۔

2۔ اگر محبوب مرد ہو (اور صنفِ نازک کے کسی فرد کو اس میں دلچسپی

ہو)۔

3۔ اگر محبوب شادی شدہ ہو (فریفتہ ہونے والا مرد ہو یا عورت)۔

1-اگر محبوب عورت ہو

محبوب چُنتے وقت یہ احتیاط لازم ہے کہ رشتہ داروں پر ہرگز عاشق نہ ہوں۔ اس کے بعد اردگرد اور پڑوس میں رہنے والوں سے بھی حتیٰ الوسع احتراز کریں۔ (یہ تجرباتی فارمولے ہیں اور طالبِ حُب کو وجہ پوچھے بغیر ان پر اندھادُھند عمل کرنا چاہیے)۔

محبوب سے ملاقات کے لیے جاتے وقت پوشاک سادہ ہونی چاہیے (رومال پر خوشبو نہ چھڑکیے۔ کہیں محبوب یا آپ کو زکام نہ ہو جائے)۔ خوراک سادہ ہو (پیاز اور لہسن کے استعمال سے پرہیز کیجیے)۔ مونچھوں کو ہرگز تاؤ نہ دیجیے ورنہ محبوب خوفزدہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی فی زمانہ بنی سنوری مونچھوں کا اثر طبعِ نازک پر کوئی خاص اچھّا نہیں پڑتا (اس کا فرمائشی مونچھوں پر اطلاق نہیں ہوتا)۔ اگر محبوب کو آپ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تو استقبال یوں ہو گا۔۔ ”تشریف آوری کا شکریہ، بڑی تکلیف کی آپ نے، بھائی جان بس آتے ہی ہوں گے، آپ بیٹھیے۔ میں دادا جان کو ابھی بھیجتی ہوں۔“ لیکن اگر محبوب کو واقعی محبّت ہے تو وہ

بھاگا بھاگا آئے گا اور آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہے گا "بِلّو جی!" (یا اسی قسم کا کوئی اور مہمل جملہ استعمال کرے گا)۔

محبوب کو یکسانیت سے بور مت کیجئے۔ ہر اتوار کو ملتے ہوں تو تیسری مرتبہ منگل کو ملنے جایئے۔ اگلی مرتبہ جمعے کو۔ بلکہ ایک ٹائم ٹیبل بنا لیجئے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں کو سنجیدہ مرد اس لیے پسند آتے ہیں کہ انہیں یونہی وہم سا ہو جاتا ہے کہ ایسے حضرات ان کی باتیں غور سے سُنتے ہیں۔ لہٰذا تسخیرِ حُب کرتے وقت "گفتگو کا فن" میں جو کچھ لکھا ہے اُسے محبوب کے لیے نظر انداز کر دیجئے۔ نہ صرف محبوب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہیے۔ بلکہ اُسے یقین دلا دیجئے کہ دنیا میں فقط آپ ہی ایسے شخص ہیں جس کے لیے محبوب کی ہر اُلٹی سیدھی بات ایک مستقل وجہ مسرّت ہے۔

محبوب سے زیادہ بحث مت کیجئے۔ اگر کوئی بحث چھڑ جائے تو جیتنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ محبوب کی رائے سے متفق ہو جایئے اور ذرا جلدی کیجئے کہیں محبوب دوبارہ اپنی رائے نہ بدل لے۔

اگر محبوب آپ کی ہر بات پر مُسکرا دے اور لگاتار ہنستا ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نفیس دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ (ایسے موقع پر مجبوب

سے پوچھئے کہ وہ کون سی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے)

اگر محبوب اپنی تعریفیں سُن کر ناک بھوں چڑھائے اور "ہٹئے بھی" وغیرہ کہے تو سمجھ لیجئے کہ اسے مزید تعریف چاہیے۔

محبوب کے میک اپ پر بھُول کر بھی نکتہ چینی نہ کیجئے۔ شاید وہ چہرہ اس لیے سُرخ کیا گیاہو کہ یہ پتہ نہ چل سکے کب شرما گیا(فقط اُس صورت میں اعتراض کیجئے جبکہ محبوب کا رنگ خدانخواستہ مُشکی ہو، اگرچہ گرم خِطّوں میں ایسے محبوب باافراط پائے جاتے ہیں)۔

ویسے ہر قسم کی تنقید سے پرہیز کیجئے۔ جو لوگ زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں ان سے محبوب کی بیزاری بڑھتی جاتی ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد محبّت میں ان کی حیثیت وہی ہو جاتی ہے جو ٹینس میں مارکر کی۔

دو باتوں سے محبوب از حد مسرور ہو گا۔ ایک تو یہ کہ کوئی اُس سے کہہ دے کہ اُس کی شکل کسی ایکٹرس سے ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس کی جو رقیب ہے وہ محض انٹلکچوئل ہے۔

محبوب کی بہن (اگر بہن کی عمر پندرہ اور پینتالیس کے درمیان ہو) کے سامنے محبوب کی کبھی تعریفیں مت کیجئے ورنہ نتائج بڑے حیرت خیز نکلیں گے۔ اور اگر

محبوب کے عیب معلوم کرنے ہوں تو اُس کی سہیلیوں کے سامنے اُسے اچھّا کہہ کر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ کبھی چھپ کر محبوب کو کسی سے لڑتے ہوئے ضرور دیکھئے۔ یا محبوب کو کسی سے لڑوا دیجئے۔ بہت سی لرزہ خیز چیزوں کا انکشاف ہو گا۔

اگر محبوب کئی مرتبہ یہ بتائے کہ آپ بالکل نوعمر لڑکے نظر آ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔

یاد رکھئے کہ محبوب کی نگاہوں میں ایک چالیس برس کا نوجوان ایک تیس سالہ بوڑھے سے کہیں بہتر ہے (اور ایسے بوڑھے اِن دنوں کافی تعداد میں ہر جگہ ملتے ہیں)۔

محبوب کی سالگرہ یاد رکھئے لیکن اُس کی عمر بھول جایئے۔

بعض اوقات محبوب کو آپ کے احسانات یاد نہیں رہتے۔ لیکن وہ فرمائشیں کبھی نہیں بھولتیں، جنہیں آپ پورا نہ کر سکے۔

اوائلِ محبّت میں محبوب سے یہ پوچھا کہ کیا اُسے آپ سے محبّت ہے؟ ایسا ہی ہے جیسے کسی ناول کا آخری باب پہلے پڑھ لینا۔

تنگدستی محبّت کی دشمن ہے۔ ایک قیمتی تحفہ مِنٹوں میں وہ کچھ کر سکتا ہے جو شاعر مہینوں برسوں میں نہیں کہہ سکتے۔

اگر محبوب کسی اور پر عاشق ہے تو سب کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اسی حالت میں برابر برابر چھڑوا دینے والے مقولے پر عمل کیجئے اور ریٹائر ہو جانا بہتر ہو گا۔ اور اگر محبوب کسی اور کی جانب ملتفت بھی نہیں، لیکن آپ کے سب حربے بیکار نظر آنے لگیں تو یہ نہ سمجھئے کہ محبوب سنگدل یا نا قابلِ تسخیر ہے۔ وہ فقط تجربہ کار ہے۔ احتیاطاً یہ ضرور معلوم کر لیجئے محبوب نے اپنے سابقہ چاہنے والوں سے کیا سلوک کیا تھا۔ وہی سلوک دوہرایا بھی جا سکتا ہے۔

یہ ہمیشہ یاد رکھایئے کہ جیسے جیسے محبوب کی عمر بڑھتی جائے گی وہ بالکل اپنی امّی کی طرح ہوتی چلی جائے گی۔

۲-اگر محبوب مرد ہو

محبوب میں سب سے پہلی چیز یہ نوٹ کیجئے کہ آیا وہ آپ کو نوٹ کر رہا ہے یا نہیں۔

محبوب سے نہ کبھی مذہب پر بحث کیجئے نہ روس پر۔ بلکہ اُس سے یہ بھی مَت

پوچھئے کہ وہ کماتا کیا ہے؟

محبوب کے سامنے کبھی کسی عورت کی برائی مت کیجئے۔ اس سے وہ بے حد متاثر ہو گا۔

محبوب سے یہ ہر گز مت پوچھئے کہ اُس نے مصنوعی دانت کب لگوائے تھے۔

یہ یاد رکھئے کہ ایک حسین عورت کی سب عورتیں دشمن ہیں اور اُن کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا لہٰذا محتاط رہیے۔

محبوب کی تعریف کرتے وقت وضاحت سے کام لیجئے۔ یہ نہیں کہ آپ خوب ہیں۔ وجیہہ ہیں۔ لاکھوں میں ایک ہیں۔ بلکہ یہ کہ آپ کا ماتھا کشادہ ہے۔ بال گھنگھریالے ہیں۔ شانے ماشاء اللہ مردوں جیسے ہیں۔

جو مرد اپنی مونچھوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ خود پسند ہوتے ہیں۔ لیکن جو شیو کرتے ہیں وہ بھی کم خود پسند نہیں ہوتے۔

اگر محبوب کلب سے پی کر آیا ہو تو بھی مت جتلایئے۔ صرف یہ کہہ کر مُنہ بنا لیجئے کہ آج پھر آپ نے جنجر پی ہے۔ اس سے وہ اس قدر خوش ہو گا کہ بیان سے باہر ہے۔

محبوب کے ساتھ کہیں بھاگ جانے کے خیال کو کبھی دل میں نہ لائیے۔ کسی کے ساتھ بھاگنا بے حد فضول حرکت ہے۔

اگر محبوب گنجا ہو تو نہ اس کی بلند پیشانی کا ذکر کیجئے نہ اس کے سر کی طرف دیکھئے۔

مرد اپنی محبت کا واسطہ دے کر محبوب کی پرانی محبتوں کے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ انہیں کچھ نہ بتائیے ورنہ پچھتانا پڑے گا۔

آپ کی باتیں خواہ کتنی ہی بے جا کیوں نہ ہوں تب تک بے جا ہیں جب تک آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ محبوب کو پتہ چل سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ رونا شروع کر دیجئے۔ اپنی رقیبوں سے خبردار رہیے۔ محبوب جن عورتوں کے متعلق باتیں کرتا رہے۔ ان کی پروانہ کیجئے۔ لیکن جب وہ کسی عورت کے ذکر سے جان بوجھ کر گریز کرے تو سمجھ جایئے کہ دال میں کالا ہے۔

یہ تو ناممکن ہے کہ آپ اپنے دل کا راز کسی اور کو نہیں بتائیں گی۔ لیکن بتاتے وقت یہ کبھی مت کہیئے تمہیں قسم ہے جو کسی اور سے کہا۔۔۔ اس سے سُننے والی کو فوراً شُبہ ہو گا اور وہ اُسی وقت سب سے کہہ دے گی۔

محبوب آپ کی تازہ ترین تصویریں مانگے گا۔۔۔ رسماً اخلاقاً یا محبّت سے۔ لیکن جب وہ آپ کی بچپن کی تصویر مانگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ بہت دُور کی سوچ رہا ہے اور

اب کچھ ہو کر رہے گا۔

شروع شروع میں محبوب کو آپ کے چچے، ماموں اور بھائی وغیرہ اچھے نہ لگتے ہوں تو کچھ دیر انتظار کیجئے۔ آہستہ آہستہ وہ خود سیدھا ہو جائے گا۔

عقلمند محبوب کو قابو میں رکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اگر محبوب بے وقوف ہو تو ذہین سے ذہین عورت کے لیے بھی اُسے ہاتھ میں رکھنا محال ہو گا۔

۳۔ اگر محبوب شادی شدہ ہو

(یہ موضوع بے حد ضروری ہے کیونکہ آج کل شادی شدہ محبوب سے عشق کرنا نہ صرف عام ہو گیا ہے بلکہ فیشن میں شامل ہے۔ روز بروز اس کی اہمیت ہر خاص وعام پر واضح ہوتی جا رہی ہے)۔

چونکہ شادی شدہ محبوب مقابلتاً تجربہ کار ہوتا ہے اس لیے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان ہدایات پر بڑی سنجیدگی سے عمل کرنا چاہیے۔ لیکن اگر شُبہ ہو جائے کہ کسی ہدایت کو محبوب پہلے سے جانتا ہے تو اسے وہیں ترک کر دیجئے (ہدایت کو) اور دوسری پر عمل کیجئے۔

شادی شدہ محبوب کو مسخّر کرنے کے لیے سب سے اہم چیز نہ حُسن ہے نہ قابلیت

بلکہ پروپیگنڈا ہے۔ لہٰذا تھوڑے عرصے کے بعد اپنے متعلق کوئی خبر اُڑا دیجیے۔۔۔ کہ آپ کا ارادہ ولایت جانے کا ہے۔۔۔۔ کبھی کلاسیکل ڈانس سیکھنے کے منصوبے باندھیے تو کبھی اُردو میں ایم اے کرنے کی خبر مشہور کر دیجیے۔

پہلے محبوب منتخب کیجیے، پھر اُسے چند فالتو خواتین و حضرات کے ساتھ مدعو کیجیے۔۔۔ پکنک۔۔۔ ادبی محفل۔۔۔ تاش یا کسی اور بہانے سے۔ آہستہ آہستہ دوسرے لوگوں کو نکالتے جائیے۔ حتیٰ کہ صرف آپ اور محبوب باقی رہ جائیں۔ (اس طرح محبوب کو شُبہ نہیں ہو گا۔ شُبہ ہُوا بھی تو دیر میں ہو گا)۔

محبوب سے اس کی نقل و حرکت کے بارے میں سوالات مت پوچھیے، کسی اور کے ساتھ دیکھ کر اُلٹی ہمدردی جتائیے۔ اُسے وہم ہو جائے گا کہ صرف آپ ہی نے اُسے سمجھا ہے۔

بہتر تو یہ ہو گا کہ ایک وقت میں کئی جگہ کوشش کیجیے۔ اگر کامیابی دس فیصدی بھی ہوئی تب بھی نا تسلّی بخش نہیں۔

کچھ ایسا انتظام کیجیے کہ محبوب ہر وقت آپ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا رہے۔ مثلاً کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکا کیجیے۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد ٹھنڈے سانس لیجیے۔ وہ بار بار پوچھے گا کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟

اپنے یا محبوب کے شریکِ حیات کا ذکر بالکل نہ آنے دیجئے۔ یوں ظاہر کیجئے جیسے اس دنیا میں نہ آپ کا کوئی ہے نہ اُس کا۔

اگر محبوب بے رُخی برتتا ہو تو اس کا خوب تعاقب کیجئے۔۔۔ بار بار فون کیجئے۔۔۔۔ ملنے جایئے۔۔۔۔ سندیسے بھیجئے۔۔۔۔ خط لکھئے۔۔۔۔ کسی دن وہ اتنا تنگ آئے گا کہ آپ پر عاشق ہو جائے گا۔ الماریوں میں چند اوٹ پٹانگ ضخیم کتابیں، دیواروں پر ماڈرن آرٹ کی بے تُکی تصویریں اور کمرے میں ستار یا وائلن ضرور رکھئے۔ خواہ آپ کو ان سے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔ محبوب یہ سمجھے گا کہ آپ کی طبیعت فنکارانہ ہے۔

تقریبوں اور پارٹیوں میں ذرا دیر سے جایئے تا کہ لوگ پوچھیں کہ یہ کون ہے؟ بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ چنئے جہاں مناسب روشنی اور موزوں لوگ ہوں۔

اگر شریکِ حیات ساتھ ہو تو سب کے سامنے اُسے کبھی ڈارلنگ مت کہئے بلکہ پبلک میں اُس کا نوٹس ہی نہ لیجئے۔

اپنے بچّے کو بھی ساتھ مت لے جایئے۔ ایک بچّے کی موجودگی سارے حسن و جمال کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ محبوب کے بچّوں کو بھی لفٹ نہ دیجئے۔

ذرا سے جھوٹ سے عجیب دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے کہ بچپن میں جھوٹ

بولنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔ شادی سے پہلے یہ ایک خوبی ہے۔۔۔۔ محبّت میں یہ ایک آرٹ ہے۔۔۔۔ اور شادی کے بعد ایک پختہ عادت۔

عینک کبھی مت لگایئے خواہ ایک فٹ سامنے نہ دکھائی دیتا ہو۔ مگر ذرا سنبھل سنبھل کر چلئے، راستے میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔

دعوتوں پر یا تو کھانا کھا کر جایئے یا واپس آکر کھایئے۔ کم خوراک ہونا بلند مذاقی کی نشانی ہے۔

افواہوں میں خاص دلچسپی لیجیئے۔ اگر محبوب کو سُنانے کے لیے نئی نئی افواہیں آپ کے پاس ہوئیں تو وہ باقاعدگی سے سُننے آئے گا۔

اگر لوگ آپ کے یا محبوب کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو ذرا خیال نہ کیجئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں میں برائیاں نہیں ہوتیں ان میں خوبیاں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ تبھی سارے دلچسپ لوگ بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

محبّت ختم کرتے وقت ہرگز مت لڑیئے۔ خدا جانے کل کلاں کہیں سابق محبوب ہی سے واسطہ نہ پڑ جائے۔

آخر میں مصنّف سفارش کرے گا کہ کبھی کبھی اپنے رفیقِ حیات سے بھی تھوڑی

سی محبّت کر لیا کیجئے۔ اُس کا بھی تو آپ پر حق ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور مفکّر نے کہا ہے کہ اپنے رفیقِ حیات سے محبّت کرنا محبّت نہ کرنے سے ہزار درجے بہتر ہے۔

چند جنرل ہدایات

محبوب سے تبھی ملئے جب اس کی صحت اچھی ہو (اور آپ کی بھی)۔ دانت یا سر کے ذرا سے درد سے دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ حسین اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے سادہ شکل والے۔ آخر الذّکر چھپے رستم ہوتے ہیں۔ یہ ہمدردی جتاتے ہیں، سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ احسانوں سے زیر بار کر دیتے ہیں۔ نشانہ درست کر کے پھر وار کرتے ہیں۔ لیکن حسین اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں آئینہ دیکھنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ذہین انسان بڑی مشکلوں سے عاشق ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں محبّت تخیّل کی فتح ہے۔۔۔ ذہانت پر۔

محبوب ایک دوسرے سے اس لیے بور نہیں ہوتے کہ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں۔

(محبّت کی شادی کے ذکر سے قصداً گریز کیا گیا ہے کیونکہ یہ جُدا موضوع ہے۔ لیکن علما کا قول ہے کہ جہاں محبّت اندھی ہے وہاں شادی ماہرِ امراضِ چشم ہے)۔

نوٹ: اگر اس مضمون سے ایک کا بھی بھلا ہو گیا تو مصنّف سمجھے گا کہ اس کی ساری محنت بالکل رائیگاں گئی۔

شیطان عینک اور موسمِ بہار

بہار آ گئی۔ ولایتی سینٹ مہکے۔ کمپنی باغ میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں، پژمردہ چہروں پر میک اَپ سے تازگی آ گئی۔ مسرّت و شادمانی کی لہر سول لائنز کے گوشے گوشے میں دوڑ گئی۔ سڑکوں پر پیراشوٹ کے کپڑے کے رنگین ملبوس دکھائی دینے لگے۔

جب قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لے کر اُٹھی تو شیطان کی عینک کھو گئی۔

شیطان کی عینک ایسی ویسی عینک نہیں جسے ہر عینک ساز مہیا کر سکے۔ ان کی عینک کے شیشوں کے افقی رُخ میں بھی کئی نمبر ہیں اور عمودی رُخ میں بھی۔ چنانچہ کچھ شمال، شمال مشرق اور جنوب مغرب، جنوب کی قسم کے شیشے ہیں۔

ایک پیچیدہ عینک کا جلد ملنا محال تھا۔ لہٰذا شیطان بغیر عینک کے دکھائی دیئے جانے لگے۔

جج صاحب نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب متعجب ہوئے سوائے شیطان کے۔ شیطان کا خیال تھا کہ لوگ بڑی تیزی سے ولایت جارہے ہیں۔ ان دِنوں تو یہ رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ کسی کے ولایت جانے پر ذرا حیرت نہیں ہوتی۔ حیرت ہوتی ہے تو اِس بات پر کہ فلاں شخص اب تک ولایت کیوں نہیں گیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ ہر شخص اللہ کو پیارا ہونے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ ولایت ضرور ہو آئے گا۔

ویسے جج صاحب کے جانے نہ جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ فکر تھا تو رضیہ کا۔ اگر وہ ساتھ چلی گئی تو بہت بُرا ہو گا۔ شیطان کا تو بہت ہی بُرا حال تھا۔ کیونکہ وہ رضیہ پر دوبارہ فریفتہ ہوئے تھے۔ ہُوا یوں کہ وہ تقریباً دو سال تک رضیہ سے نہ مِل سکے۔ جب وہ باہر سے آتے تو جج صاحب کا کُنبہ کہیں چلا جاتا، جب کُنبہ آتا تو شیطان کہیں اِدھر اُدھر ہوتے۔ پورے دو سال بعد وہ چاء پر رضیہ سے ملے۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ وہ جج صاحب کے ساتھ ولایت جارہی ہے۔ بڑی رسمی قسم کی گفتگو ہوئی۔ شیطان نے پوچھا۔ آپ کے مشغلے کیا ہیں؟ آپ کے محبوب ایکٹر اور پسندیدہ مصنفین کون کون سے ہیں؟ روس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ شام کو کیا کِیا کرتی ہیں؟ بی اے

میں آپ کے مضامین کیا تھے ؟ آپ کو شلوار پسند ہے یا غرّارہ؟ آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی کون کون سی کتابیں آپ نے نہیں پڑھیں۔۔۔؟

کچھ دنوں کے بعد شیطان نے بیان دیا کہ جمعے کی سہ پہر کو چار بج کر پچپن منٹ سے وہ رضیہ پر نئے سِرے سے عاشق ہو گئے ہیں۔

اُن کی حالت اِس قدر مخدوش ہو چکی تھی کہ میں سچ مُچ اُن کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ میں دست بردار کیوں ہوا؟ شاید یہ قربانی کا جذبہ تھا۔ جذبۂ ترحم تھا یا وہ لافانی فوق البشر آسمانی جذبہ جو انسان کے دِل میں کبھی کبھی آتا ہے جو روح کو لامتناہی وسعتوں میں لے جاتا ہے۔ جو انسان کو فرشتوں میں لا کھڑا کرتا ہے جذبہ جو۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

دستبردار ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ مجھے یقین تھا کہ چاہے شیطان کچھ کر لیں رضیہ اُن کی جانب کبھی ملتفت نہیں ہو گی، بنے گا کچھ بھی نہیں۔

شیطان تو عاشق ہو گئے۔ لیکن رضیہ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ویسے رضیہ کا رویہ ہم سب کے متعلق عجب مولویانہ سا تھا۔ اُسے کسی سے محبّت ہوتی تھی نہ نفرت۔

شیطان نے مجھے فون کیا اور چاء پر ایک کیفے میں بلایا۔ پوچھا کہ اور کون ہو گا؟ بولے یونہی ایک آدھ دوست وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ میں کیفے کے دروازے میں داخل ہوا تو یک بیک بلّیوں کی چیخیں، کتّوں کے رونے کی آوازیں، مرغیوں کی فریادیں ملی جلی سنائی دیں۔ معلوم ہُوا کہ آرکسٹرا کوئی انگریزی دھن بجارہا ہے۔ شیطان کو ڈھونڈنا مصیبت ہو گئی۔ جدھر دیکھتا ہوں اجنبی چہرے نظر آتے ہیں۔ آخر انہوں نے خود آواز دی۔ عینک کے بغیر وہ واقعی اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے۔ دراصل عینک ان کے چہرے کا جزو بن چکی تھی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے ان کو عینک کے بغیر بھی دیکھا ہو۔ شاید ایّامِ طفلی میں بھی وہ عینک لگاتے ہوں گے۔

پوچھا کہ باقی اصحاب کہاں ہیں؟ انہوں نے اشارے سے بتایا، ایک تو میں ہوں اور یہ تین وغیرہ وغیرہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تین بالکل ایک جیسی عینکیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ بالکل ایک جیسی شبیہیں تھیں۔ پہلے تو خیال ہُوا کہ کہیں ایک چہرے کا عکس مختلف آئینوں میں تو نہیں پڑ رہا۔ شیطان نے تعارف کرایا۔ ”یہ کریمہ ہیں۔ یہ رحیمہ ہیں اور یہ سفینہ۔“

میرے لئے وہ تینوں بالکل ایک سی تھیں۔ سب سے پہلے نظر عینکوں پر جاتی جو ایک ہی تھیں۔ عینکوں کے عقب میں جو تھوڑے بہت خدوخال دکھائی دیتے وہ بھی ایک جیسے تھے۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں اُن میں تمیز نہ کر سکا۔ بار بار ایک ہی لڑکی کے سامنے کیک سرکاتا رہا۔ اور اپنی طرف سے یہی سمجھتا رہا کہ طشتری تینوں کو پیش کی تھی۔ ایک لڑکی کو مس نرینہ بھی کہہ گیا۔ جس پر شیطان نے دوبارہ ان کے نام لیے۔ مجھے صرف کریمہ یاد رہا۔ شاید کریما بہ بخشائے بر حالِ ما کی وجہ سے۔ کریمہ تینوں میں کم معمولی تھی۔ ویسے وہ حسین ہوتے ہوتے بال بال بچ گئی تھی۔

آخر میں نے ہمّت کی اور تینوں کو مس کریمہ اور سفینہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا اور بتایا کہ مجھے اُن سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شیطان نے لفظ مِس کئی دفعہ دوہرایا اور بولے "جانتے ہو دنیا میں عورت یا تو HIT ہوتی ہے۔۔۔ اور یا پھر مِس۔"

چاء کے بعد شیطان انہیں چھوڑنے چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا ان کے نام یاد کرتا رہا۔ دفعتاً کوئی شخص زور زور سے نمکین پانی کے غرارے کرنے لگا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا تھا۔

شیطان نے واپس آ کر کہا۔ "اب تمہارے ذمّے تین لڑکیاں اُدھار ہیں۔" انہوں نے میری رائے طلب کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مُعنّک لڑکیوں سے آج تک میرا واسطہ نہیں پڑا اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر اس صورت میں جب کہ شیطان کی مُعنّک کزن کسی کالج میں استانی ہیں۔ البتّہ ایک شعر میں نے کہیں سے سُنا تھا

اگرچہ عینکوں سے فرق کچھ اتنا نہیں پڑتا

مُعنّک لڑکیوں پر لوگ عاشق کم ہی ہوتے ہیں

لیکن اُن کا خیال تھا کہ عینک لڑکی کا زیور ہے۔ عینک کو مقوّیٔ حسن کا درجہ دیا گیا ہے۔ کئی چہرے تو عینک کے بغیر اچھّے معلوم نہیں ہوتے۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ وہ چہرے نہیں تھے۔ دراصل وہ چہرے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔

انہوں نے بتایا کہ یہ مختلف کالجوں میں پڑھتی ہیں، مہینے میں پندرہ دن ہوسٹلوں میں رہتی ہیں اور پندرہ دن گھر۔ ان سے واقفیت بھی خوب ہوئی۔ موسمِ بہار کی آمد پر بھی شیطان کی عینک کو گم ہوئے چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ انہوں نے سینما میں اپنی اُن کزن کو دیکھا جو اُستانی ہیں۔ وہ ایک گوشے میں بالکل اکیلی بیٹھی تھیں۔ یہ اُن کے پیچھے جا بیٹھے۔ پہلے گلا صاف کیا، کھنکارے۔ پھر ایک ترقّی

پسند سا شعر پڑھا، مگر وہ خاموش رہیں۔ شیطان نے عینک کے شیشے صاف کرنے کا مشورہ دیا کہ میلے ہو رہے ہیں۔ وہ چپ رہیں۔ یہ شکائتیں کرنے لگے کہ مہینے ہو جاتے ہیں اور تم نہیں ملتیں۔ ہم بلاتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے۔ خود اکیلی سینما آ جاتی ہو۔ پہلی تاریخیں ہیں۔ تمہیں تنخواہ ملی ہو گی۔ دیکھیں تمہارا بٹوہ۔

جب شیطان نے بٹوے پر ہاتھ ڈالا تو چھینا چھپٹی شروع ہو گئی۔ آس پاس کے لوگ دیکھنے لگے۔ آخر فتح شیطان کی رہی اور انہوں نے بٹوہ چھین لیا۔ اب جو قریب سے انہیں دیکھتے ہیں تو وہ کوئی اور تھیں۔ بڑے شرمندہ ہوئے۔ جو معافی مانگنی شروع کی تو انہیں فلم بھی نہ دیکھنے دی۔ پکچر ختم ہوئی تو انہیں گھر چھوڑنے گئے اور دوستی ہو گئی۔ یہ تھی کریمہ جس کی بائیں آنکھ پر شیطان بُری طرح فریفتہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ اکثر شیطان کی دائیں طرف بیٹھی اور وہاں سے بائیں آنکھ مقابلتاً قریب ہوتی ہے۔

ایک روز شیطان کافی ہاؤس میں تھے کہ دروازہ کھُلا۔ کریمہ آئی اور شیطان کے سامنے سے ہوتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئی۔ انہیں بہت بُرا لگا۔ یہ اُٹھے اور اسی طرح تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے سامنے جا بیٹھے۔ کچھ اندھیرا سا تھا۔ انہوں نے خفگی کا اظہار کیا اور کہا کہ لڑکیوں کو آداب بالکل نہیں آتے۔ اگر

باتیں کرنا نہیں چاہتی تھیں تو کم از کم ہیلو ہی کہہ دیتیں۔ اسی طرح تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ جب اچھی طرح خفا ہو چکے تو معلوم ہُوا کہ یہ کریمہ نہیں تھی کوئی اور مُعَنَّک لڑکی تھی۔ شیطان نے بڑی خوشامدیں کیں۔ بات بات پر ہِی ہِی کرتے رہے۔ بالائی اور کافی منگوائی۔۔۔ یہ رحیمہ تھی۔

تیسری لڑکی سفینہ خود کنارے آگئی۔ اور ایک دن کریمہ اور رحیمہ کے ہمراہ چڑیا گھر میں مل گئی۔

"تو سارا قصور تمہاری گمشدہ عینک کا ہے" میں نے پوچھا۔

"اور موسم بہار کا بھی۔۔۔" وہ بولے

میں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو تب تک ملتوی کر دیں جب تک ان کی نئی عینک نہیں آجاتی۔

"عینکیں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ موسم بہار بہت دیر میں آتا ہے۔" وہ آہِ سرد کھینچ کر بولے۔ "اور پھر رضیہ نے بھی تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

ہم نے بل منگوایا۔ شیطان نے حسبِ معمول بل کا بغور مطالعہ کیا۔ دوبارہ میزان کیا اور ساڑھے تین آنے کی غلطی نکالی۔ بیرہ بل درست کرا کے لایا۔ میں نے چار آنے پلیٹ میں چھوڑ دیئے۔ بیرے نے بہت بُرا مُنہ بنایا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ شیطان نے آواز دے کر واپس بُلا لیا اور چار آنے طشتری سے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیے۔

ہم باہر نکلے موٹر سائیکل سنبھالی اور جج صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ جس طرح ملازمت میں اینٹی ڈیٹ ملتی ہے اسی طرح انہیں بھی وہ کئی سال مل جانے چاہئیں جو انہوں نے رضیہ کے عشق گزارے۔ ان کا عشق تب سے گنا جائے جب وہ پہلی مرتبہ رضیہ پر عاشق ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے کافی سینیئر ہو جاتے تھے۔

پھاٹک پر ہمیں ننھّا ملا جو غلیل لئے کھڑا تھا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ حکومت آپا شکار کھیلنے گئی ہیں جج صاحب کے ساتھ۔۔۔ یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ حکومت آپا کی جُدائی میرے لئے ہمیشہ مسرّت آمیز ہوتی ہے۔

شیطان بولے۔ ”کاش، مجھے پہلے پتہ چل جاتا۔ جہاں وہ گئی ہیں وہاں کے جانوروں کو مسلح کر دیتا۔“

ہم نے رضیہ کے متعلق دریافت کیا۔ ”یقین کیجئے بھائی جان، میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر رضو آپا میں ایسی کیا چیز ہے جو آپ دونوں کو پسند ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ بے حد معمولی دکھائی دیتی ہیں۔“

”جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے تو تمہارا معیار یقیناً بدل جائے گا۔“

”مگر میں نے تو عمر بھر ایسی لڑکی نہیں دیکھی جس نے مجھے متوجّہ کیا ہو۔“

شیطان ننّھے میاں کو دیکھ کر دانت پیستے اور قسم کھاتے کہ اگر وہ کبھی اسمبلی کے ممبر بن گئے تو ایک قانون نافذ کرائیں گے جس کی رو سے عشّاق کو اجازت ہو گی کہ اگر محبوب کا کوئی ایسا چھوٹا بھائی ہو تو اسے جاں بحق تسلیم کر دیں۔

شیطان ان دنوں کچھ حسّاس سے ہو گئے تھے۔ بہار آتے ہی وہ حسّاس ہو جاتے ہیں۔

بیگم ملیں۔ ”سُناؤ بچّو کیسے ہو۔۔۔ تمہاری موٹر سائیکل کیسی ہے“؟

”جی خُدا کے فضل سے اچھّی ہے اور آپ کی خیریت کی طالب ہے۔“

”بھائی جان آپ کی موٹر سائیکل کی طاقت کتنی ہے؟“

”ڈھائی ہارس پاور۔۔۔“

"یعنی دو گھوڑے اور ایک بچھیرا۔۔ لیکن جس روز میں اس پر سوار ہوا تو ساڑھے تین ہارس پاور کی ہو جائے گی۔ امّی جان ہارس پاور کا ترجمہ کیجئے۔۔"

"مجھے کیا پتہ کہ یہ کمبخت پاور ہاؤس کیا بلا ہے۔۔۔"

"قوّتِ اسپ" ننھّا سینہ پھُلا کر بولا۔

"یہ دن بدن شرارتی ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ آج یہ کہیں سے ایک چھوٹا سا بچّے کا بکرا پکڑ لایا۔ جو اودھم مچایا ہے تو خدا کی پناہ۔۔۔"

بیگم نے ذرا دوسری طرف دیکھا اور شیطان غائب تھے۔

"امّی جان۔ ایف اے خان صاحب کی موٹر آئی ہے۔"

یہ ایف اے خاں شاید کوئی فقیر احمد یا فدا احمد وغیرہ تھے۔ ان پر ننّھے میاں خاص طور پر مہربان تھے۔ ہر ملاقات پر سلام کے بعد سوال ہوتا۔۔ "چچا جان آپ برسوں سے ایف اے خاں کیوں ہیں؟ لوگ ایم اے ہو گئے مگر آپ بی اے خاں تک نہیں ہوئے۔"

"مسز خاں بھی آئی ہوں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اتنی دیر تم ننّھے کو پڑھاؤ۔ اس کا سبق بھی سُننا۔ یہیں بیٹھے رہو، باہر مچھلیاں اور مچھر بہت ہیں۔"

سب سے پہلے ننّھے میاں نے اپنی تازہ ترین تھیوریاں پیش کیں کہ ”دراصل آسمان ایک سیاہ خول ہے جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ اس خول کے پیچھے نہایت تیز روشنی رہتی ہے۔ ہم ان سوراخوں کو ستارے سمجھتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز والے اگر زیادہ اُونچے چلے گئے تو خول سے ایسے ٹکرائیں گے کہ دھڑام سے آواز آئے گی اور سب کا انتقال ہو جائے گا۔ اور یہ کہ کششِ ثقل کے بالکل اُلٹ ایک اور کشش بھی ہے جو انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے۔ اس کا نسخہ ابھی تک معلوم نہیں ہُوا۔ جس روز دریافت کر لیا گیا سفر میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ لوگ شُوں سے آسمان کی طرف اُڑ جایا کریں گے۔ اتنی دیر میں زمین گردش کرتی رہے گی اور وہ شہر دُور چلا جائے گا۔ جب نیا شہر آنے والا ہو گا تو مخالف گیئر لگا کر کششِ ثقل کے ذریعے نیچے اُتر آیا کریں گے۔“

اِس کے بعد وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انسان اپنا توازن کس طرح قائم رکھتا ہے۔ اگر پونے چھ فُٹ کے لٹھ کو زمین پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ فوراً گر پڑتا ہے لیکن انسان کھڑا رہتا ہے اور نہیں گرتا۔ انہیں یہ بات بھی حیرت میں ڈالتی تھی کہ پانی پت کی لڑائیاں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے بغیر کیونکر فتح کی گئیں۔

بڑی مصیبتوں سے میں نے ننّھے میاں سے پیچھا چھڑایا۔ دبے پاؤں باغیچے میں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نہایت سہانا سماں ہے، معطّر جھونکے چل رہے ہیں۔ تارے جگمگا رہے ہیں۔ چاند ابھی نکلا تو نہیں لیکن ارادہ کر رہا ہے۔ فوّارے کے سامنے رضیہ اور شیطان یوں پوز بنائے کھڑے ہیں جیسے تصویر اُتروا رہے ہوں۔

شیطان نے ایک نہایت لمبی آہ بھری، اتنی لمبی کہ میں حیران رہ گیا۔ بڑے غمگین لہجے میں بولے "ٹوٹے چمک چمک کر ستارے اُمید کے اک خواب تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوتا رہا"

"اک خواب تھا کہ تابہٴ سحر دیکھتے رہے۔" رضیہ نے لقمہ دیا اور دونوں روش پر چلنے لگے۔ وہ میرے قریب سے گزرے۔ شیطان تو اتنے قریب تھے کہ میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر گُدگُدی کر سکتا تھا۔

"جی ہاں بالکل وہی۔۔۔ اُف یہ ستارے کتنے اُداس ہیں ۔ رات بھر سُنسان فضاؤں میں اکیلے ٹمٹماتے رہتے ہیں۔ میری زندگی بھی ستارے کی طرح اُداس اور تنہا ہے۔"

جس جگہ میں چھپا ہُوا بیٹھا تھا وہ ایسی تھی کہ اگر ذرا بھی ہلتا تو نظر آ جاتا۔ اس لئے میں ان کا تعاقب نہیں کر سکا۔ اب وہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ رضیہ کہہ رہی

تھی "اوّل تو آپ ان سب کو ستارے نہیں کہہ سکتے۔ ستارے وہ ہیں جو سیّاروں کی طرح گردش نہیں کرتے مثلاً سورج ستارہ ہے۔ ہر ستارے کے گرد کئی سیّارے گھومتے ہیں۔ اجرامِ فلکی اتنی حسین چیزیں ہرگز نہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اُجاڑ اور بے نُور ہیں۔ دونوں دُور نکل گئے۔"

اِس مرتبہ لوٹے تو شیطان بڑے پُردرد انداز میں کہہ رہے تھے "خدایا یہ کیا اسرار ہے کہ جس سے محبت کرنے لگو اس کا دِل پتھّر کی سِل بن جاتا ہے۔ بالکل بے حس۔ اس پر اتنا سا بھی تو اثر نہیں ہوتا۔"

جب واپس آئے تو رضیہ کہہ رہی تھی "آپ نے یہ کیا فورڈ فورڈ لگا رکھی ہے۔ فورڈ کا بیوک سے کوئی مقابلہ نہیں۔ فورڈ تو اُن کاروں میں سے ہے جنہیں آج خریدو تو دو سال کے بعد کھینچنے کے لئے بیلوں کی جوڑی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ میرے قریب سے پھر گزرے۔ اس مرتبہ شیطان نے رضیہ کی کلائی تھام رکھی تھی، اس کی ننھی سی گھڑی کو بالکل آنکھ سے لگا رکھا تھا۔ اور کہہ رہے تھے "زمین اپنے محور کے گرد تقریباً آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اس لئے اب تک ائرونا ٹکس سے اس کا کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔

اب جیٹ پروپلشن سے انقلاب آ جائے گا اور ہوائی جہاز ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑا کریں گے۔ لہٰذا زمین سے آگے نکل جایا کریں گے۔ ہمارے موجودہ وقت کا نظام بے کار ہو جائے گا۔ اور تمہاری یہ پیاری سی گھڑی بھی بالکل بے کار ہو جائے گی۔" اتنے میں جھاڑی میں کسی نے زور سے چھینک ماری۔ پھر ننّھے میاں سرپٹ بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔

میں اور شیطان موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور وہ پیچھے بیٹھے تھے۔ اس لئے چلّا چلّا کر میرے کان میں باتیں کر رہے تھے۔ ننّھے میاں کے متعلق بے حد لطیف جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اس مَردود بچّے کو رشوت دینی پڑے گی۔"

"لیکن اس میں اُس کا کیا قصور عشق، مُشک اور چھینک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہ بتاؤ کہ آج باتیں کیسی ہوئیں؟"

"ایک ماڈرن لڑکی کے ساتھ اس سے زیادہ رومانی گفتگو ناممکن تھی۔ بس سمجھ لو کہ حالات بڑے اُمّید افزا ہیں۔"

"اور وہ کریمہ، نرینہ، مہینہ؟"

''تم نام غلط مت لیا کرو''

میں چند دنوں کے لیے باہر چلا گیا۔ واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ شیطان دن میں آٹھ دس مرتبہ فون کرتے تھے جو غریب فون پر بولتا اس پر بے حد خفا ہوتے جیسے وہ جان بوجھ کر میری نقل و حرکت چھپا رہا ہو۔

معلوم ہُوا کہ محض میری وجہ سے ان کی پارٹی ملتوی ہو گئی جس میں وہ تینوں لڑکیاں مدعو تھیں۔ پوچھا کہ پارٹی کِس تقریب میں ہو رہی ہے؟ بولے ابھی تک تو سوچا نہیں۔ شیطان انہیں اتنی دفعہ مدّعو کر چکے تھے کہ تمام معقول بہانے ختم ہو گئے تھے۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ جنوبی امریکہ یا شمالی افریقہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کو جو خود مختارانہ حقوق ملے ہیں اس خوشی میں ہم ایک شاندار پارٹی دیں۔

شیطان کی ایسی پارٹیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ ایک تو وہ اتنا بڑا ہجوم اکٹھا کر لیتے ہیں کہ کسی جلسے کا شُبہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ دیر سے پہنچتا ہوں۔ دُور بیٹھتا ہوں۔ دوسرے لوگوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ سب سے پہلے چلا آتا ہوں۔ ہر ممکن طریقے سے یہ جتا دیتا ہوں کہ پارٹی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

چنانچہ میں دیر لگا کر پہنچا۔ شیطان سڑک پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کسی خاص مسرّت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا چہرہ جوں کا توں رہا۔ آنکھیں جس سمت میں تک رہی تھیں اُسی سمت میں تکتی رہتی۔ میں سمجھا کہ خفا ہو گئے ہیں۔ قریب گیا پھر بھی وہ اسی طرح ہوا میں دیکھتے رہے۔ میں نے اشارے کئے ہاتھ ہلائے، سر ہلایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دفعتاً علیل ہو گئے ہوں۔ پھر مجھے ان کی عینک یاد آ گئی جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ دفعتاً اچھل پڑے۔

جب ہم جلدی جلدی سڑک عبور کر رہے تھے تو شیطان سر کے بل ایک سائیکل میں جا گھسے۔ اتفاق سے سائیکل چل رہی تھی اور اُس پر ایک شخص سوار تھا۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور دراز ہونے کے لئے ایسی جگہ چُنی جہاں پانی ہی پانی تھا۔

شیطان نے بڑے انکسار سے ”آئی ایم سوری“ کہا اور آگے چل دیئے۔ میں نے اُنہیں روکا۔

”اسے اُٹھائیں؟“

”ضرورت تو نہیں۔ میں نے سوری کہہ دیا۔“

”ذرا سہارا دے دیں۔“

"لیکن کہہ تو دیا سوری۔"

"مگر وہ خود نہیں اُٹھ سکتا۔"

"تو میں کیا کروں۔ میں نے سوری کہہ دیا ہے۔ اسے اور کیا چاہیے؟"

ہم کیفے میں داخل ہوئے، باہر پلاٹ میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور آرکسٹرا بج رہا تھا۔ لوگوں میں سے گزرتے ہوئے شیطان نے ایک کتّے کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتّے نے ایک عظیم الشّان نعرہ لگایا۔ شیطان مُڑے، کتّے کی طرف جھک کر سوری کہہ دیا۔

میں نے ان تینوں لڑکیوں کو سلام کیا۔ مجھے ان کے نام ابھی تک یاد نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے کوشش شروع کر دی۔ ایک بورژوا قسم کا کتّا کرسی پر آبیٹھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو سُونگھنے لگا۔ شیطان نے غالباً اُسے ادنیٰ بازاری کتّا سمجھ کر زور سے ڈانٹا اور پتھّر اُٹھانے کی نیّت سے ایک ہاتھ زمین کی طرف لے گئے۔ کتّا ڈرا بالکل نہیں۔ اس نے شیطان کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ساتھ کی میز سے آواز آئی۔

"جیکی واپس چلے آؤ۔"

لڑکیوں نے شیطان کی اس حرکت پر اظہارِ افسوس کیا کہ اتنے اچھے خاندانی کتّے کو خفا کر دیا۔ شیطان بولے "بات یہ ہے کہ آج تک کوئی کتّا میری زندگی میں داخل نہیں ہوا۔"

جب لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں، شور مچا رہی تھیں اور آرکسٹرا جاز کی گت بجا رہا تھا تو شیطان نے چپکے سے مجھ سے عہد کر لیا کہ میں کبھی انہیں عینک کے سلسلے میں نہیں ٹوکوں گا۔ ان کی کمزوری کو صیغۂ راز میں رکھوں گا۔

گفتگو کے موضوع صرف دو تھے۔ پہلا موضوع شادی تھا اور دوسرا موضوع بھی شادی تھا۔ شیطان کریمہ کے ساتھ لگے ہوئے اس کی بائیں آنکھ کو بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی "میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی جو دولت مند ہو، صاف گو اور دلیر ہو، صاحبِ عزّت اور صاحبِ دماغ ہو، نمایاں شخصیت کا مالک ہو اور مشہور و معروف ہو۔"

"تم نے دیر لگا دی" شیطان بولے "مسز چرچل اُس شخص کو بھی کبھی ہتھیا چکی ہیں۔"

"میرا انتخاب آخری ہو گا۔" جیسے انہوں نے شیطان کی بات ہی نہیں سُنی۔ "اور جِسے میں نے پسند کیا، اُس کے ساتھ جہنّم میں بھی رہنے کو تیار ہوں گی۔"

"تم نے اپنی اور اُس خوش نصیب کی منزل خوب چُنی ہے۔"

شیطان کچھ اور قریب ہو گئے۔ اتنے کہ جب وہ باتیں کرتے تو کریمہ کی عینک کے شیشے دُھندلے ہو جاتے اور اسے بار بار صاف کرنے پڑتے۔

شیطان نے کچھ اور قریب ہو کر بجلی کے ایک بہت بڑے قمقمے کی طرف اشارہ کیا جسے وہ غالباً چاند سمجھے تھے۔ میں نے جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر چاند کی طرف کر دیا جو درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے چاند کی تعریف کی، نظارے کو سراہا اور کریمہ سے رائے طلب کی۔

"چاند اچھا ہے، تارے بھی بُرے نہیں ہیں۔ پیسٹری اچھی ہے۔ صرف اس میں مکھّن زیادہ ہے۔" جواب ملا۔

شیطان نے بیرے کو بلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ "یہ آرکسٹرا والوں کو دے دو، ایسے حسین ماحول میں کوئی اچھا سا والز سُننے کو جی چاہتا ہے۔"

"اور آتے وقت کچھ گرم گرم سموسے لیتے آنا۔" ایک لڑکی بولی۔

آرکسٹرا والے شاید شیطان کے رقعے کے منتظر ہی تھے، ابھی بیرا وہاں تک پہنچا نہ تھا کہ والز شروع ہو گیا۔ شیطان کریمہ کے کچھ اور قریب آ گئے۔

"کیا خیال ہے؟" انہوں نے آگے جھک کر آرکسٹرا والوں کی طرف اشارہ کیا اور کریمہ کی عینک کے شیشے دُھندلے کر دیئے۔

"ذرا نمک زیادہ ہے آپ بھی چکھئے" اُس نے طشتری سامنے کر دی۔

ذرا سی دیر میں دوسرا والز بج رہا تھا اور شیطان سفینہ سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے خاندان کے قصیدے سُنا رہی تھی کہ ان کے خاندان میں کوئی ستّر فیصدی خان بہادر تھے، بیس فیصدی نواب زادے اور باقی صاحب زادے۔ بچّے یورپین گورنسوں کے ساتھ عمر بھر رہتے تھے۔ لڑکیاں کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی شادی کسی ایمپیریئل سروس والے سے ہو جاتی جو انہیں سیدھا انگلینڈ لے جاتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا تھا؟ اس کا ذکر اس نے نہیں کیا۔

اس نے شیطان کے آباؤاجداد میں بھی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے متعلق دریافت کیا۔ شیطان نے پہلے تو ٹال مٹول کی جب اصرار بڑھا تو بولے۔ "جی ہمارا شجرہ نسب صدیوں پہلے لنگوروں سے جا ملتا ہے۔ غالباً ڈارون کی تھیوری پر تو آپ کا

بھی اعتقاد ہو گا۔ لہٰذا آپ کے بزرگ اور ہمارے بزرگ اکٹھے ہی رہا کرتے تھے۔"

تیسرا والز شروع ہُوا اور شیطان رحیمہ کے ساتھ بیٹھے۔ کریمہ اور سفینہ باتیں آپس میں کر رہی تھیں اور مُنہ میری طرف کر رکھا تھا۔

میں نے مغز کے کباب ان کی طرف بڑھا کر کہا "لیجئے دماغ کھائیے۔"

اور ایک کباب پر تھوڑا سا شوربہ ڈال کر دوسری کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کچھ جھجکیں، میں مُصِر رہا۔۔۔ "کھائیے بھی مغز۔۔۔ آپ تو تکلّف کرتی ہیں۔۔۔"

اب ریکارڈ بج رہے تھے۔ گویا کروسو نہایت دلکش نغمہ الاپ رہا تھا۔ رحیمہ اور شیطان نہایت ذہین قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

"اب مجھے ہی لیجئے۔ مجھ پر ایسے دورے اکثر پڑتے ہیں اور میں اس قدر پریشان ہو جاتا ہوں کہ جب سوتا ہوں تو جاگتا رہتا ہوں۔ بس ایک وہم مجھ پر سوار ہو جاتا ہے کہ شاید میں اتنا عظیم انسان نہیں ہوں جتنا کہ ہوں۔"

"کروسو کو احساسِ کمتری تھا۔ وہ بالکل چھوٹا سا ٹھکا ہوا آدمی تھا۔ تبھی اُس کے گانے میں اتنا سوز ہے۔ یا تُو اس کا گلا اتنا سُریلا تھا یا اسے زکام کی شکایت رہتی ہو گی۔ غالباً وہ انگریزی کے پکّے گانے گاتا تھا۔"

اب سناٹرا کا ریکارڈ بج رہا تھا۔

"یونہی مُخنّی سا فاقہ زدہ انسان ہے یہ سناٹرا۔"

"اور مقصود صاحب۔۔۔؟" کسی نے مقصود گھوڑے کے متعلق پوچھا۔ وہ بھی کبھی کبھی گایا کرتا تھا۔

"آدمی تو فضول سے ہیں لیکن ان کے پاس کار نہایت عمدہ ہے۔" سفینہ بولی۔

شیطان کے کان کھڑے ہوئے۔ ان دنوں مقصود گھوڑے سے ان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔

"آپ کے وہ دوست آپ کے ساتھ کبھی نہیں آئے۔" کریمہ نے پوچھا۔

"یہ چاکلیٹ کی پیسٹری نہیں چکھی آپ نے۔" شیطان نے جواب دیا۔

"ان کی کار واقعی نہایت خوبصورت ہے۔ وہ ہمیشہ ہوتے بھی اکیلے ہیں۔"

"بیرا!" شیطان چلائے۔۔۔ "تم کچھ سموسے کھاؤ گی؟"

"کافی کھا چکی ہوں۔ چلئے آپ کے لئے کھادوں گی۔"

"دیر ہو گئی۔۔۔۔ کیا وقت ہو گا؟" کریمہ نے پوچھا۔

"دس بجنے میں بیس منٹ ہیں۔" میں نے بتایا۔

"تو چلیں۔۔۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ تمہاری گھڑی آگے ہے۔" شیطان بولے۔ "صرف نو بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔"

جب ہم کیفے سے باہر نکلے تو شیطان کہیں غائب ہو گئے۔ دیکھا تو ایک اور تانگے میں بیٹھے ہیں۔ چونکہ میں عہد کر چکا تھا کہ ان کی بینائی کا ذکر نہیں کروں گا اس لئے خاموش تھا۔

مقصور گھوڑا مانگی ہوئی کار میں مجھ سے ملنے آیا اور لڑکیوں سے متعارف ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ شیطان سے پوچھو۔ شیطان بڑے خفا ہوئے کہ خبر دار جو کسی نے میری لڑکیوں کی طرف دیکھا بھی ہے تو۔ شاید وہ مقصود گھوڑے کی مانگی ہوئی کار سے گھبراتے تھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے "اور تم اپنا قرض کیوں نہیں چُکاتے۔ لاؤ کہاں ہیں تین لڑکیاں۔"

ادھر جیسے حادثوں کی بارش شروع ہو گئی اور حادثے موسلادھار برسنے لگے۔

شام کو کلب گیا۔ دیکھتا ہوں کہ چند فلاسفر قسم کے مُعنّک حضرات شیطان کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ایسی گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ کمرے کا درجہ حرارت کافی بڑھ گیا ہے۔

ایک صاحب جنہوں نے اپنے آپ کو کامریڈ مشہور کر رکھا تھا اور شاید کامریڈ تخلّص بھی کرتے تھے شیطان کے چہرے میں اپنی عینک ٹھونسے ایک اور کامریڈ کی باتیں کر رہے ہیں جو کسی دوسرے برّاعظم سے تعلّق رکھتے تھے۔

"وہ موٹے ہیں۔ شاید اس لئے وسیع خیالات کے انسان ہیں۔" شیطان بولے۔

"وہ نہایت تجربہ کار انسان ہیں۔" کامریڈ بولے۔

"اور تجربہ کیا ہے۔ غلطیوں کا دوسرا نام۔ میں تو انہیں اوّل نمبر کا قنوطی انسان سمجھتا ہوں۔ حالانکہ انہیں انسان سمجھنا بھی زیادتی ہے۔"

"وہ کروڑوں مردوں کے پیش رو ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ وہ مردوں کا تو پیش رو ہے اور عورتوں کا پیرو۔"

"عورتوں کا پیرو نہیں، عورتوں کے پیرو کہیئے۔" وہ چلّائے۔

"عورتوں کا پیرو۔۔کا پیرو۔۔۔کا پیرو۔" شیطان نے میز پر مکّا مارا! دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"میرے ساتھ ذرا باہر چلو۔" شیطان اُن کی گردن پکڑ کر چیخے۔

ہم انہیں باہر لے آئے۔ روشن سڑکوں سے دُور ایک تاریک گوشے میں اس ڈویل کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ شیطان نے ان کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ کیا تم نے پہن رکھا ہے۔ اپنی طوطے جیسی ناک پر؟ اسے اتار دو۔ ورنہ میں تمہیں پیٹنے سے انکار کرتا ہوں۔" انہوں نے عینک زمین پر دے ماری۔

اب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم نے ان دونوں کو دُور دُور لے جا کر چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ غالباً کامریڈ صاحب کی بینائی بھی شیطان کی طرح بے حد کمزور تھی۔ پہلے انہوں نے آستینیں چڑھائیں اور پھر ہوا میں مُکّے لہراتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ کامریڈ نے دفعتاً ایک نعرہ بلند کیا اور ایک درخت کے تنے کو پیٹ ڈالا۔

"کدھر دفع ہو گئے؟" انہوں نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم کہاں ہو؟" شیطان نے بالکل اُن کے قریب سے گزرتے۔

پھر دیکھتے دیکھتے شیطان تڑپے اور ایک سمت میں بھاگے۔ ہوا میں ایک مکّہ جو گھمایا تو اتفاق سے کامریڈ کی کمر میں لگا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور طیش میں آ کر چلائے۔ "یہ مُکّہ مجھے کس نے مارا ہے؟ تماشائی ایک طرف رہیں، اگر میں نے کسی کو شرارت کرتے دیکھ پایا تو بُرا سلوک کروں گا۔"

ہم میں سے باری باری ہر ایک ان کے قریب سے گزرتا۔ ان دونوں کی توجّہ ہماری طرف زیادہ تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ چلّا چلّا کر ایک دوسرے سے پوچھتے۔ "تم کہاں ہو؟" اس کے بعد کبڈی سی شروع ہو جاتی۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف سمتوں میں اتنی دُور چلے گئے کہ ہم پکڑ کر واپس لائے۔

غرضیکہ آدھ گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری لڑائی میں صرف ایک مکّہ کار آمد ثابت ہوا، جو شیطان کا تھا اور کامریڈ صاحب کی کمر میں اتفاقاً جا لگا۔

اس کے بعد دیر تک دیا سلائیاں جلا جلا کر کامریڈ صاحب کی عینک ڈھونڈتے رہے۔

شیطان بدنام ہوتے جا رہے تھے۔ لوگ شکایتیں کرتے کہ مغرور ہو گیا ہے، پہچانتا نہیں۔ سامنے سے نکل جاتا ہے۔ دیکھ لیتا ہے اور سلام تک نہیں کرتا۔ سلام کا جواب نہیں دیتا۔

گھر میں پردے پر بحث ہو رہی تھی۔ شیطان کا خیال تھا کہ پردہ سرد ملکوں کے لئے نہایت مفید چیز ہے۔ نزلے زکام وغیرہ کے بچاؤ کا نہایت اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن گرم ملکوں کے لئے اتنا کارآمد نہیں۔ گرم ملکوں میں صرف سردیوں میں پردہ کرنا چاہیے۔ گرمیوں میں ململ کے لباس میں بھی سب کا اتنا برا حال ہو جاتا ہے۔ برقع پہن کر نہ جانے کیا حالت ہوتی ہو گی۔ جو لوگ پردے کے زیادہ حامی ہیں اور بہت شور مچاتے رہتے ہیں اُن سب کو جولائی اگست میں برقع پہنا دیا جائے اور ستمبر میں رائے پوچھی جائے۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ شیطان کے خالو آ گئے، وہ کچھ مہینوں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ذرا سی دُور کُرسی پر جا بیٹھے۔ شیطان نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور بولے۔۔ ”معاف کیجئے حضرت میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“

”ضرور دیکھا ہو گا۔“

”آپ کا چہرہ کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔“

"سچ مُچ؟"

"لیجئے سگریٹ پیجئے۔۔ معاف فرمایئے میں چہرے یاد رکھ سکتا ہوں۔ نام یاد نہیں رکھ سکتا۔" شیطان نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور خالو کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ شیطان کے خالو جو خفا ہوئے ہیں تو بس۔

پھر ایک اور تماشا ہوا۔ شام کو شیطان سفینہ کو لینے اس کے گھر گئے اور غلطی سے پڑوس کے کسی ویسے ہی مکان میں جا گھسے۔ نمبر تو انہیں نظر ہی نہیں آتے تھے بس اندازاً مکانوں میں چلے جایا کرتے۔ پھاٹک، میدان، برآمدہ عبور کرتے ہوئے اندر پہنچے۔ ابھی حدود اربعے سے اچھّی طرح واقف نہیں ہوئے تھے کہ آواز آئی کون ہے؟ اس کے بعد کھسر پھُسر ہوئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شیطان نے اپنی طرف سے سفینہ کی امّی کے کمرے کا رُخ کیا جو مقابلتاً محفوظ جگہ تھی۔ کمرے کی تصویریں دیکھ کر انہیں شُبہ سا ہُوا کہ شاید کسی اور کے گھر چلے آئے ہیں۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کی تصویر دیکھ ہی رہے تھے کہ چنگھاڑ سنائی دی۔ "اچھا تو تم ہو۔" ایک عمر رسیدہ بزرگ ہاتھ میں لٹھ نُما چھڑی لئے داخل ہوئے۔

"تو تم ہی وہ لڑکے ہو جس نے ہم سب کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

"باہر جانا چاہتا ہوں۔" شیطان ہکّے بکّے رہ گئے۔ انہوں نے بزرگ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"میں نے سُنا ہے کہ تم ہر ایک سے کہتے پھرتے ہو کہ تم لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو۔ آج تمہاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی۔ ابے او فتولا اُس مقصودن کو یہاں۔"

جیسا نام تھا ویسی ہی ایک لڑکی کمرے میں آ گئی۔

"لو یہ ہے وہ۔ اب اسے دیکھ لو۔ نیچے کیا دیکھ رہے ہو؟ اس کی طرف دیکھو۔"

شیطان دیکھنے لگے۔

"دیکھ چکے کیا؟"

"جی ہاں!"

"اچھا تم جاؤ" شیطان چلنے لگے۔

”نہیں تم نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا ہے۔ اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے عزیزوں کی طرف سے پیغام کیوں نہیں بھجواتے؟ یوں بدنام کیوں کرتے پھرتے ہو؟ اس طرح چوروں کی طرح گھر میں گھسنا شریف آدمیوں کا کام ہے کیا؟“

”جی آپ کی بینائی کمزور تو نہیں؟ یا کہیں عینک تو نہیں کھوئی گئی۔“

”اِدھر اُدھر کی باتیں مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔“

”جناب میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ میں شریف آدمی ہرگز نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو شرابی کبابی اور جواری ہوتے ہیں۔“

اور ایسے سرپٹ بھاگے کہ دس پندرہ منٹ تک کمروں کے اندر ہی دوڑتے رہے۔ بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ ملا۔

مجھے سب کچھ سنایا تو میں نے پوچھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ شیطان نے کہا کہ انگریزی دوائیوں اور ومنٹو کی بوتلوں میں الکحل کی ذرا سی مقدار ہوتی ہے۔ کباب ہم خوب کھاتے ہیں اور برج بھی کھیلتے ہیں جو سراسر جوا ہے۔ لہٰذا ہم سب شرابی کبابی اور جواری ہیں۔

میں نے بہت مجبور کیا کہ خدا کے لئے کہیں سے عینک لگوا لو اور شریفوں کی زندگی بسر کرنے لگو۔ وہ ہر بار یہی کہتے کہ تم مجھے برا بھلا کہ لو ڈانٹ لو لیکن عینک کا ذکر مت کیا کرو۔ میرے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ آخر بڑی بحث کے بعد وہ مانے اور ایک عینک ساز کو نمبر دے آئے۔ اگلے ہفتے ہم عینک لینے گئے۔ دکان میں مجسمے رکھے ہوئے تھے جن کے چہروں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں۔ شیطان سیدھے ایک بڑے سارے مجسمے کی طرف گئے اور مُسکرا کر بولے ''آداب عرض، میری عینک تیار ہو گئی یا نہیں۔''۔ میں نے جلدی سے ان کا مُنہ دکاندار کی طرف کیا جو بالکل دوسری طرف تھا۔

عینک لگا کر وہ ضد کرنے لگے کہ موٹر سائیکل چلائیں گے۔ چنانچہ مجھے پیچھے بیٹھنا پڑا۔ ہم کچھ دور ہی نکلے ہوں گے کہ وہ چلائے۔ ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ موٹر سائیکل جھومی اور بڑے زوروں سے جھاڑیوں میں جا گھسی۔ ہم دونوں دُور دُور گرے۔ شیطان کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ ''قبلہ معاف کیجئے۔ میں نے ہارن نہیں دیا تھا۔ ویسے آپ کو فٹ پاتھ پر چلنا چاہیے تھا۔''

میں نے انہیں ڈانٹا کہ مجھ سے یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو۔ جس سے ٹکرائے ہو اس سے کہو۔ ہم نے اس شخص کو بہت ڈھونڈا جس سے ٹکّر ہوئی تھی۔ مگر سڑک خالی پڑی تھی۔ غالباً شیطان کسی غیر مادی چیز سے ٹکرا گئے تھے۔ جو دیکھتا ہوں تو اُن کی عینک چہرے پر نہیں ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ جیب میں رکھ لی تھی۔

ساڑھے چار بجے میں چاء پینے جج صاحب کے ہاں پہنچا تو وہاں چار بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومت آپا موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی ہیں۔ جج صاحب اکیلے بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ جج صاحب فائلیں دیکھنے میں منہمک رہے اور میں انہیں منہمک رہتے دیکھنے میں منہمک رہا۔ دفعتاً وہ چونکے۔ "چاء پیو برخوردار"۔

اور کچھ نئی فائلیں اُٹھا کر پڑھنے لگے۔

کچھ دیر بعد پھر چونکے "چاء پیو۔۔۔ پیتے کیوں نہیں؟"

میں نے بڑی ساری چاء دانی کو اُٹھایا۔ وہ یکلخت اوپر چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ خالی ہے۔ کھولا تو اندر صرف چاء کی پتیاں تھیں۔

"آخر تم چاء کیوں نہیں پیتے؟" انہوں نے خفا ہو کر کہا۔

"جی چاء دانی خالی ہے۔"

"اچھا؟" انہوں نے میز پر رکھے ہوئے برتنوں کا جائزہ لیا۔ "تو اس میں دُودھ ہو گا۔ دُودھ پیو۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ دُودھ بھی نہیں تھا۔ "جی دُودھ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر" انہوں نے شکر دانی کی طرف اشارہ کیا۔ "تھوڑی سی چینی چکھو۔"

فائلیں ختم کر کے وہ بڑے ملائم لہجے میں نوکروں پر خفا ہو کر مجھے کلب لے گئے۔ وہاں شکار کی باتیں ہونے لگیں۔ جج صاحب کے متعلق کلب میں مشہور تھا کہ اگر کوئی ان سے صرف اتنا کہہ دے کہ پچھلے مہینے جب میں فلاں تالاب کے پاس سے گزر رہا تھا وہاں ایک مُرغابی بیٹھی تھی تو وہ فوراً بندوق لے کر اس جگہ جا پہنچیں گے اور اس وقت تک منتظر رہیں گے جب تک وہ مُرغابی یا کوئی اور مُرغابی واپس نہیں آتی۔ اُن کے دوست اُن کی نئی بندوق کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اس بندوق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سلو موشن میں فائر کرتی ہے اور فائر کی آواز کے بعد گولی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بندوق چلنے کی آواز آتی ہے پھر نشانہ خطا ہوتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اتنی دیر میں جانور یا پرندہ چوکنا ہو جاتا ہے اور پینترہ بدل کر وار صاف بچا جاتا ہے۔ واپسی

میں اُن کی کار خراب ہو گئی۔ مجھے کہا گیا کہ ہینڈل لگاؤں۔ کافی محنت کے بعد موٹر سٹارٹ ہو گئی۔ ابھی میں ہینڈل ہاتھ میں لئے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بار بار پھسلتا کیوں تھا کہ فرّ سے آواز آئی اور کار سامنے سے غائب تھی۔ سڑک کافی ویران تھی اس لئے دُور تک ہینڈل ہاتھ میں لے کر پیدل چلنا پڑا۔ گھر پہنچ کر جج صاحب نے جرح شروع کر دی۔ ”تم کہاں رہ گئے تھے؟ لڑکوں میں یہ اچھل کُود کی عادت بہت بُری ہے۔ چلتی موٹر سے ہر گز نہیں اُترنا چاہیے۔ اور یہ ہینڈل تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟“

کوٹھی کے دوسری طرف جا کر دیکھا تو شیطان اور ننّھے میاں کو محوِ گفتگو پایا۔

”ننّھے آج تمہاری رضو آپا کیسی لگ رہی تھیں“؟ شیطان نے پوچھا۔

”جیسی لڑکیاں لگا کرتی ہیں۔ فقط آج ان کی قمیض نہایت اچھی تھی۔“

”ننّھے تمہارے لئے اس اتوار کو کیا لاؤں؟“

شیطان ہر اتوار ننّھے کو رشوت دیتے۔ جو چیز دیتے اُسے اگلے اتوار تک چپکے سے چرا لیتے اور پھر اُلٹا ننّھے کو ڈانٹتے کہ کہاں گئی۔

”بتاؤ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟“

ننھّا سوچ کر بولا "مجھے پیکارڈ کا نیا ماڈل بہت پسند ہے۔"

بیگم آ رہی تھیں۔ ننّھے نے جلدی سے کتاب کھول لی۔

"اقّوہ بیٹا پڑھ رہا ہے۔" بیگم بولیں۔ "رُوفی یہاں تم اِس سے کچھ سوال بھی تو پوچھا کرو۔"

جب بیگم آتیں ہمیں خواہ مخواہ ننّھے کا امتحان لینا پڑتا۔

ہم نے اُسے ترجمہ کرنے دیا۔ سٹیفن لی کاک کے کتاب سے ننّھے نے نہایت سلیس ترجمہ کیا۔ یہاں تک کہ آخیر میں مصنّف کے نام کا بھی ترجمہ کر ڈالا اور لکھا۔ سٹیفن لی مرغ۔۔!

"بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟" بیگم نے بڑے فخر سے پوچھا۔

"جی میں پہلے تو ایم۔ اے کروں گا۔ اس کے بعد پہلی جماعت میں پھر داخل ہو کر دوبارہ ایم۔ اے تک پڑھوں گا۔ یعنی ڈبل ایم۔ اے کروں گا۔ اس کے بعد وکالت پڑھ کر خفیہ مشق کیا کروں گا۔"

"خفیہ مشق؟"

"ذاتی مشق"ننّھے میاں نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتی ہے۔"

"پرائیویٹ پریکٹس! ترجمہ کیا ہے۔" ننّھے میں بولے۔

"کچھ مستورات آرہی ہیں۔" ملازم نے بتایا۔

"بھائی جان مستورات کا واحد کیا ہوتا ہے؟"

"مستور۔"

"واہ۔۔۔ یہ بھی کبھی سُنا ہے کہ ایک مستور آرہی ہے۔"

خواتین آئیں۔ جنہیں میں نے تو پہچان لیا لیکن شیطان یونہی ہوا میں تکتے رہے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" انہوں نے بڑی بے اعتنائی سے پوچھا۔

"پہچانتے نہیں؟ تمہارے خالو کی لڑکیاں ہیں" بیگم بولیں۔

بیگم جب کبھی شیطان کے خالو کی چھ لڑکیوں کو لے کر نکلتیں تو شیطان کہا کرتے۔

"وہ آرہی ہیں بیگم معہ چھ تکبیروں کے۔" بیگم چاہتی تھیں کہ رات کا کھانا ہم وہیں کھائیں "آج تمہارے لئے حلووں کا انڈہ پکا ہے۔"

سامنے باورچی خانے میں ایک بلّی بڑے مزے سے دُودھ پی رہی تھی اور شیطان کے خالو کی سب سے چھوٹی لڑکی پاس کھڑی اپنے رنگین ناخن دیکھ رہی تھی۔ بیگم چلائیں۔ "اے بلّی! ذرا پیچھے مُڑ کر دیکھنا۔ وہ ننھّی دُودھ پی رہی ہے۔"

وہ سب چلے گئے تو شیطان نے بتایا کہ ہفتہ ہُوا کسی شخص نے خواب میں ان کی ہتک کی۔ انہیں بُرا بھلا کہا اور بڑے زور سے ان کے مکّا بھی مارا۔ وہ ہر رات یہ نیّت کر کے سوتے ہیں کہ اگر وہ شخص انہیں خواب میں مل گیا تو مار مار کر اُس کا بھرُکس نکال دیں گے۔ "بھائی جان کیا بہت زور سے مکّا مارا تھا اُس نے؟" ننّھے نے پُوچھا۔

"ہاں بہت زور سے۔"

"اتنے زور سے کیا۔۔۔؟" ننّھے میاں نے ایک مکّا شیطان کی کمر میں رسید کیا۔ شیطان کچھ دیر اپنے ہونٹ چباتے رہے۔ پھر ننّھے کے قریب جا کر بولے۔ "اتنے زور سے نہیں۔ اتنے زور سے!" اور ننّھے میاں نے ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی موقع پر پہنچتا، شیطان نے زور زور سے ننّھے کو ڈانٹنا شروع کیا۔ "اور چڑھو اُونچے درختوں پر پاؤں نہ پھسلے گا تو اور کیا ہو گا۔ اچھّا ہُوا گر پڑے۔"

بیگم دوڑی دوڑی آئیں۔ننّھے کی ایک نہ سُنی گئی اور اُسے خوب دھمکایا چمکایا گیا۔

دن گزرتے جارہے تھے۔ شیطان کا جوش و خروش جتنا اُن تینوں لڑکیوں کے لئے تھا۔ ویسا ہی رضیہ کے لئے تھا۔ یا یوں کہ جیسا جوش و خروش رضیہ کے لئے تھا ویسا ہی ان تینوں لڑکیوں کے لئے۔ ہر روز ان کے ارادے بدلتے رہتے۔ رضیہ مغرور ہے اور پروا نہیں کرتی۔ اس لئے کریمہ سے شادی بہتر رہے گی۔ خصوصاً جب اس کی بائیں آنکھ اتنی پیاری ہے۔"۔۔رحیمہ کے قہقہے نہایت سُریلے ہیں اور ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ یقیناً بہتر بیوی ثابت ہو گی۔ پرانی محبّت پھر پُرانی محبّت ہے جو جذبات رضیہ کے لئے ہیں وہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتے۔ سفینہ کی بہنیں کتنی خوبصورت ہیں۔ سفینہ سے شادی کرنا کس قدر مفید ہو گا۔"

ہر روز وہ غلط جگہوں پر چلے جاتے۔ غلط لوگوں سے اُلجھ جاتے۔ صحیح لوگوں کے قریب سے گزر جاتے۔ سائیکل کے حادثے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتے لیکن انہوں نے عینک نہ لگوانی تھی نہ لگوائی۔

ادھر وہ لڑکیاں شیطان کی اس کمزوری سے واقف تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ میں جان بوجھ کر خاموش رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ شیطان کے ساتھ آجاتیں۔ بقیہ شامیں اور لڑکوں کے ساتھ گزارتیں۔ جب کبھی کوئی خاص

تقریب ہوتی تو وہ بن سنور کر اُن حضرات کے ساتھ نکلتیں جن کے پاس کار تھی۔ اُن کے جاننے والوں میں سے ایک صاحب گویّے تھے جو ریڈیو پر پکّے راگ گاتے تھے۔ ان کا رنگ بھی پکّا تھا۔ سُنا تھا کہ ان کی آنکھیں نشیلی تھیں۔ چونکہ وہ ہر وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتے۔ اس لئے ہم اُن کی نشیلی آنکھوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے جو ہمیشہ تانگہ ساتھ لایا کرتے اور یہ بار بار جتاتے کہ وہ خود بیمہ شدہ ہیں، تانگہ بیمہ شدہ ہے، یہاں تک کہ گھوڑا بھی بیمہ شدہ ہے۔ افواہ تھی کہ اُن کے بال گھنگھریالے ہیں۔ لیکن صد حیف کہ جب بھی ہم نے انہیں دیکھا قدرے گنجا پایا۔ ایک صاحب طالبِ علم تھے جو سفینہ کے ہم جماعت تھے کرائے کی سائیکل پر آیا کرتے تھے اور بار بار گھڑی دیکھتے رہتے۔

بعض اوقات سینما دیکھتے دیکھتے ایک لڑکی شیطان سے اجازت مانگتی کہ پچھلے درجے میں اُس کی خالہ بیٹھی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ اس لئے وہ اُن کے پاس جانا چاہتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں اُسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا۔ یہ چیز بار بار دوہرائی جاتی۔ چاء پیتے وقت تو کیفے میں ضرور کسی نہ کسی کی امّی یا ممانی آجاتیں۔ شیطان بڑی خندہ پیشانی سے انہیں رخصت کرتے

اور اُن کی امّی جان یا خالہ جان کی خدمت میں آداب بھی بھجواتے جس کی رسید اگلے روز ملتی۔

ان جانے والوں کو وہ تو سہیلیاں کہہ کر یاد کرتیں اور یا کزن کہہ کر ہمیں اکثر بتایا جاتا کہ آپ ہمیں گھر چھوڑ کر نکلے ہی ہوں گے کہ ہماری ایک کار والی سہیلی آ گئی۔ یا یہ کہ ہم فلاں باغ میں گئے، وہاں ایک سہیلی نے نہایت درد بھرا گانا سُنایا۔ ایک اور سہیلی کو ہم نے سائیکل پر بھیجا کہ چوک والی دکان سے چاکلیٹ لائے۔ سفینہ کے کزن ہر تیسرے روز تانگہ لے آتے ہیں۔

کبھی کبھی شیطان کو یونہی شُبہ ہو جاتا۔ ''کل آپ کسی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہی تھیں۔''

''نہیں تو۔۔۔ وہ لڑکا تو نہیں تھا۔ وہ تو میرے چچا تھے۔ آپ نے اُن کی فرنچ کٹ داڑھی نہیں دیکھی کیا۔''

شیطان جنہیں شاید لڑکے کے گلے کا سکارف دکھائی دیا تھا مُسکراتے اور کہتے ''افّوہ! کیسی غلط فہمی ہونے لگی تھی۔'' پھر کسی اور سے پوچھتے۔ ''پرسوں شام کو آپ ایک لڑکے کے ساتھ کار میں جا رہی تھیں؟''

''لڑکے کے ساتھ؟'' وہ بڑے تعجّب سے کہتی۔ ''لڑکا کہاں تھا۔ لڑکی تھی۔''

"میری چچازاد بہن۔ بڑی آپا۔ وہ دوپٹہ کبھی سر پر نہیں رکھتیں اور ان کے بال بھی تراشیدہ ہیں۔"

"میں بھی کیا ہوں؟" شیطان ایک ادا کے ساتھ کہتے۔ "اور پھر ان دنوں لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیسے معلوم ہوتا ہے؟ ایک سے چُست رنگین لباس، ایک وضع کے بنے ہوئے بال ویسی ہی خوشبو کی لپٹیں۔ یہاں تک کہ ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ رفعت شوکت، حشمت اور طلعت میں لڑکے کون سے ہیں اور لڑکیاں کون سی۔"

جج صاحب کے ہاں بھی ان لڑکیوں کا ذکر آ جاتا۔ ایک دفعہ بیگم نے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ وہ تین لڑکیاں کون ہُوا کرتی ہیں؟"

"جی وہ میری سہیلیاں ہیں۔" شیطان نے جواب دیا۔

جج صاحب نے بھی پوچھا۔ "سُنا ہے کہ تم آج کل کچھ لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو۔"

"جی ہاں! ابھی تک تو صرف تین لڑکیاں ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک ایک آدھ کا اضافہ ہو جائے۔"

"جب میں یورپ میں تھا تو میں بھی لڑکیوں کو ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک لڑکی ہوتی تھی۔ تمہاری طرح ریوڑ لے کر نہیں نکلتا تھا۔"

پھر کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "یہ بتاؤ کہ تم اس ملک میں لڑکیوں سے دوستی کیونکر کر لیتے ہو؟"

شیطان نے بھی کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "جناب یہ گُر میں ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ یہ اُستادی شاگردی کا معاملہ ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آہم۔ وہ ذرا۔۔۔ تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟" وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

حکومت آپا نے پہلے تو لڑکیوں کو دیکھا۔ پھر شیطان کی طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولیں۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔"

رضیہ کو علم تھا لیکن اس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔

کبھی رضیہ شیطان سے اچھی طرح باتیں کر لیتی تو وہ کئی دنوں تک یہ شعر بار بار پڑھے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر اتوار کو تینوں لڑکیوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ یہ شعر سُنایا جاتا۔

انجامِ محبّت ہے ہر حال میں رسوائی

کچھ اس کا سبب چُپ ہے کچھ اس کا سبب باتیں

ایک دن شیطان کو نہایت شدید رومانی دورہ اٹھا اور انہوں نے عجب اُلٹی سیدھی حرکتیں کیں۔ پہلے تو جج صاحب کے سامنے اکبر کا یہ شعر پڑھ دیا۔

میں ہُوا رخصت اُن سے اے اکبر

وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

ابھی وہ اچھی طرح خفا بھی نہ ہوئے تھے کہ بیگم کے سامنے بہک گئے۔ بیگم تیس سال پہلے کے قصّے سُنا رہی تھیں کہ لڑکپن میں مَیں ایسی تھی۔ زیور اس طرح پہنا کرتی۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ یہ تھا وہ تھا۔

شیطان ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولے۔ ”کاش کہ میں آپ سے پہلے ملا ہوتا۔“

اس کے بعد رضیہ کا نمبر آیا۔ میں چھُپ کر سُن رہا تھا۔ پہلے رضیہ کی تعریفیں ہوئیں۔ پھر لگے ہاتھوں اظہارِ محبّت بھی کر ڈالا۔ اور بالکل وہی الفاظ دہرائے جنہیں رضیہ بار بار سُن چکی تھی۔

''میں محبّت کے تمام معیاری طریقے آزما چُکا لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔''

رضیہ حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی کہ موسم پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ فلمیں فضول سی لگی ہیں۔ اچھّے کتّے کہیں نہیں ملتے۔ جب شیطان کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ لڑکے آج کچھ کہتے ہیں اور محض چند برسوں میں بدل جاتے ہیں۔

''میں بھلا کیونکر بتا سکتا ہوں کہ اگلے سال میرے خیالات کیا ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق تو صرف ولی اللہ ہی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ البتہ میرا ماضی تم جانتی ہو۔ رہا حال، سو تم پر عیاں ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر پامسٹری کی اور لکیروں کی باتیں کر چکنے کے بعد کہا، ''مگر یہ سارا ہاتھ تو میرا ہے۔''

''لیکن آپ مجھے بہت کم جانتے ہیں۔''

"میرے خیال میں میں تمہیں کافی جانتا ہوں۔ تم قبول صورت ہو۔ سگھڑ ہو۔ امورِ خانہ داری میں ماہر ہو۔ سلیقہ شعار ہو۔ پیتے کھاتے خاندان کی لڑکی ہو۔ تم سے بہتر لڑکیاں بھی میں نے دیکھی ہیں۔ مگر دنیا میں رضیہ صرف ایک ہی ہے۔"

"اُفّوہ! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔" رضیہ بولی۔

"اور تمہارے نظریے مولویانہ ہیں۔ تم غلط ملک میں آ گئیں۔ تمہیں کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ حج کرو، شرعی کپڑے پہنو، حافظ بنو، نمازیں پڑھو، اذانیں دو۔

دو اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں

کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں"

شیطان بڑے خوش خوش ملے۔ پوچھا "کیسے رہے؟"

بولے۔ "جو کچھ دل میں تھا کہہ دیا۔"

پوچھا۔ "ہاں ہوئی یا نا؟"

بولے۔ "یقیناً نا ہوئی۔"

شیطان کی سالگرہ آئی۔ پکنک کا پروگرام بنا کہ شہر سے باہر دریا کے کنارے دن گزارا جائے۔ ان تینوں لڑکیوں کی تین اور سہیلیاں آ رہی تھیں۔ اس لئے شیطان بڑے مسرور تھے۔ ہم گراموفون ریکارڈ چُننے لگے تو انہوں نے اصرار کیا کہ "وائن میوزک وومن" والا ریکارڈ ضرور ساتھ لے چلیں۔

"کل وہاں تینوں چیزیں ہوں گی۔ موسیقی ہو گی، خمار ہو گا اور لڑکیاں ہوں گی۔"

نوکر ہاتھ میں فہرست لئے حساب لگا رہا تھا۔ "چار درجن سینڈوچز اور تین بڑے کیک"

"اور لڑکیاں۔۔۔" شیطان آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"چار سیر مٹھائی، پندرہ انڈے اور تین درجن مالٹے ہوں گے۔" نوکر پنسل سے لکھتا جا رہا تھا۔

۔"۔۔اور لڑکیاں ہوں گی۔" شیطان نے ٹھنڈا سانس لیا۔

صبح صبح ہم انہیں لینے گئے۔ تینوں نئی لڑکیاں بھی مُعنّک تھیں۔ ویسے انہوں نے بغیر فریم کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ سب لڑکیوں کے چہروں پر بلا کا نکھار تھا۔ غضب کی تازگی تھی۔ چہرے خوب چمک رہے تھے۔ عینکیں بھی چمک رہی

تھیں۔ آسمان پر بادل تھے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے ایک دو مرتبہ بارش ہوئی۔ پھر بڑی تیز دھوپ نکلی۔ ہم کچھ بھیگے کچھ پسینہ آیا۔ اب جو غور سے اُنہیں دیکھتے ہیں تو عجب حُلیہ بنا ہُوا تھا۔ سارا میک اَپ اُتر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اُن کی اصلی شکلیں دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ کریمہ کی ہلکی ہلکی مونچھیں نظر آرہی تھیں۔ رحیمہ کے ہلکے ہلکے گُل مچھے تھے جیسے تاریخِ ہند کی تصویروں میں مغل بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔ سفینہ بھوئیں اکھیڑتی تھی۔ چنانچہ اس کی خود ساختہ بھوؤں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نئی لڑکیوں کے چہروں پر بھی کئی ایسے نقوش ابھر آئے تھے جو پہلے پوشیدہ تھے۔ ہمارا گروہ کچھ سرکس سا معلوم ہو رہا تھا جس میں ہر نمبر اور ہر سائز کی شخصیتیں موجود تھیں۔ لڑکیوں میں جس کی شکل بہت اچھی تھی وہ دبلی بہت تھی اور قد نہایت لمبا تھا۔ جس کی مُسکراہٹ حسین تھی وہ فربہ بہت تھی۔ جو سمارٹ معلوم ہو رہی تھی وہ ویسے بخشی ہوئی تھی۔ جس کی باتیں بہت اچھی تھیں وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ غرضیکہ ایک لڑکی بھی نارمل نہیں تھی۔

اُدھر شیطان بار بار مجھے تاکید کرتے کہ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس طرح اپنی توجہ چھ پر تقسیم کرکے برابر برابر بانٹنا کسی انسان کے لئے تو نہایت مشکل ہے۔ البتّہ ایک حقّہ یہ فرض بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔

ہم مچھلیاں پکڑنے بیٹھے۔ لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کسی نے خاموش ہونے کو کہا کہ مچھلیاں نہ بھاگ جائیں۔

"آپ ضرور شور مچایئے۔" شیطان نے دریا میں اپنے خدوخال دھوتے ہوئے کہا۔ "ان کم بختوں کو کسی طرح تو پتہ چلے کہ ہم انہیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بارش کا ایک اور چھینٹا پڑا۔ ہم سب درختوں کی طرف بھاگے۔ شیطان صبح سے ایک نئی لڑکی کو بڑی عجیب طرح دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

"یہ آج تو بالکل مون سون کی قسم کی بارش ہو رہی ہے۔" وہ بولی۔

"مون سون میں ہنی مون کیسا ہوتا ہو گا۔" شیطان کچھ اور نزدیک آ گئے۔

"چلئے وہاں چلیں۔ یہ درخت تو ٹپک رہا ہے۔ لایئے میں آپ کا بٹوہ تھام لوں۔ بوجھل معلوم ہو رہا ہو گا۔"

اس نے بٹوہ دے دیا۔

"یہ درخت بھی لِیک کر رہا ہے۔ چلئے۔" شیطان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "شکریہ! مجھے اپنا ہاتھ بوجھل نہیں معلوم ہو رہا۔"

بارش رُکی تو شیطان نے چیزیں گرم کرنے کے لئے لکڑیوں کا چولہا بنایا۔

جب آگ جلائی گئی تو چولہا بھی جل گیا اور کئی چیزیں بکھر گئیں۔ شیطان کو سالگرہ کی

مبارکباد ملی۔ چھوٹے موٹے تحفے بھی ملے۔ وہ کہنے لگے کہ کل تک وہ صرف پچیس سال کے تھے۔ اور آج چھبیس سال کے ہو گئے۔ صرف ایک رات میں سال کا فرق پڑ گیا۔ یہ خوشی کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ پھر اس نئی لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”میں دنیا کی ہر چیز سے گریز کر سکتا ہوں سوائے ترغیب کے۔ گستاخی معاف آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟“

”میری منگنی ہو چکی، میرے کزن کے ساتھ۔“

”وہ کیا کرتے ہیں؟“

”ان کے والد لکھ پتی ہیں۔“

”اُفّوہ! تو کیا آپ نے محض دولت کے لئے۔“

"اُفّوہ! ہاں میں نے محض دولت کے لئے۔۔۔ اور پھر اس ملک میں تو رومانی، زبردستی کی، اپنی یا ہونے والے خاوند کی پسند کی، خواہ کیسی بھی ہوں سب شادیاں دو تین سال کے بعد ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔"

"اور آپ شادی کب کر رہی ہیں؟" شیطان نے دوسری نئی لڑکی سے پوچھا۔

"میں شاید کبھی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے نوکروں، گھر کے حساب کتاب، دھوبیوں اور بچّوں سے سخت نفرت ہے۔"

"بچّوں سے کیوں نفرت ہے؟"

"اس لئے کہ مجھے پالتو جانوروں اور پرندوں سے بھی نفرت ہے۔"

"اور آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟" کریمہ نے شیطان سے پوچھا۔

"ہاں ہاں! بتائیے کب ہو رہی ہے؟" سب ایک دم بولیں۔

"پہلے اپنے ایک کان میں انگلی ڈال لیجئے۔ پھر بتاؤں گا۔" شیطان نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ بات ایک کان سے سُنی جاتی ہے اور دوسرے سے اُڑائی جاتی ہے۔"

"نہیں یہ تو ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

دراصل جو راز شیطان اُنہیں بتاتے وہ چند دنوں میں ہر جگہ مشہور ہو جاتا۔ ایک دفعہ شیطان نے غلطی سے لڑکی کی امّی کی جگہ براہِ راست لڑکی کو یہ پیغام بھیج دیا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمایئے۔ لڑکی بے حد خفا ہو گئی۔ شیطان نے یہ بات کریمہ کو بتائی اور تاکید کی کہ کسی اور سے مت کہنا۔ اس نے رحیمہ کو بتائی اور کہا کہ ہرگز کسی اور کو مت بتانا۔ چلتے چلتے یہ بات شیطان تک پہنچی اور جس عقل مند نے شیطان کو بتائی اس نے انہیں بھی تاکید کی کہ کسی اور کو مت بتانا۔

"میں مستقبل سے نہیں گھبراتا بلکہ مستقبل مجھ سے ڈرتا ہے۔" شیطان مُنہ پھُلا کر بولے۔

"مگر حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد عاشق کی حالت نہایت خستہ ہو جاتی ہے۔ نانا فرنویس نے کہا ہے کہ عاشق پہلے بوسے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسرا بوسہ جیتتا ہے۔ تیسرے کے لئے منّت سماجت کرتا ہے۔ چوتھا قبول کرتا ہے۔

پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں اور باقی ماندہ بے شمار بوسے برداشت کرتا ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" سفینہ بولی۔ "اور رحیمہ وہ تمہارا کزن۔"

"میرا کزن کیوں ہوتا؟ تمہارا ہو گا۔"

"واہ ملنے تو وہ تم سے آیا کرتا ہے۔ کریمہ کے دونوں کزنوں کے ساتھ۔"

"تعجّب ہے۔" ایک نئی لڑکی بولی۔ "کریمہ کا تیسرا کزن سفینہ کے کزن کو بھی کریمہ ہی کا کزن سمجھتا ہے اور سفینہ کا کزن بھی اسے یہی سمجھتا ہے۔"

"خواتین! خواتین!" شیطان بولے۔ "ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ہم حضرت آدم کی اولاد ہیں۔"

اتنے میں نوکر نے مژدہ سنایا کہ چاء کی پتیاں گھر رہ گئیں۔ شیطان نے نوکر کو چاء کی تلاش میں ایک سمت روانہ کیا اور خود دوسری طرف نکلے۔ میں لکڑیاں چُن رہا تھا۔ لڑکیاں گھاس پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میرے کان اُن کی طرف تھے۔

نئی لڑکی کہہ رہی تھی۔ "یہ روفی بالکل یونہی ہے۔ خاک سجھائی نہیں دیتا۔ آج کریمہ دیر تک کھڑی ہو کر مُنہ چڑاتی رہی اور اُنہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ بس یونہی دیکھتے رہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سُنی سُنائی باتوں کا یقین نہیں کرتے اور چشم دید واقعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اور یہ جو دوسرے صاحب ہیں کتنے عجیب سے ہیں! بس اپنی ہی دنیا میں بستے ہیں۔"

"خیر عجیب تو نہیں ہیں۔" نئی لڑکی نمبر دو عجب انداز سے مُسکرائی۔

"یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ رُوفی کسی جج وج کے ہاں جاتا ہے۔ یہ بھی کسی مجسٹریٹ کے ہاں جاتا ہو گا۔ یہ سب اوّل نمبر کے ہرجائی اور طوطا چشم ہوتے ہیں۔ ہر لڑکی سے فلرٹ کرنے کو تیار ہیں۔ بس کسی طرح موقع مل جائے۔ لیکن عاشق صرف اس پر ہوتے ہیں جو ان کی پہنچ سے باہر ہو۔ ان کا رویّہ بالکل وہی ہوتا ہے کہ ووٹ دیتے وقت غلام محمد صاحب کا خیال رکھئے لیکن ووٹ میاں محمد حسین ہی کو دیجئے۔ اور محبوب پر بھی تب تک عاشق رہتے ہیں جب تک وہ پہنچ سے باہر ہو۔ پھر جب شادی کا موڑ آتا ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر کسی دولت مند

مشہور گھرانے میں پیغام بھجواتے ہیں اور ایسی بھیگی بلّی بن جاتے ہیں جیسے پہلے کسی لڑکی سے بات تک نہیں کی۔"

"تم رُوفی کی برائیاں کیوں کرتی ہو؟ اگر یہ اتنا ہی بُرا ہے تو اس کے ساتھ کیوں پھرا کرتی ہو؟" نئی لڑکیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ بے حد دلچسپ ہے۔ بس اس میں صرف یہی ایک خوبی ہے۔"

"اور وہ تمہارا کار والا، وہ گویّا اور وہ تانگے والا؟"

"کار والا مغرور اور خود پسند سا ہے۔ اس کے ساتھ ہم صرف کار کی وجہ سے جاتی ہیں۔ ورنہ وہ ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اگر موڈ اچھا ہو تو وہ گویّا بہت اچھّا رفیق بنتا ہے۔ اور اگر اداس ہوں تو وہ تانگے والا خوب ہے۔ کم بخت اور بھی اداس کر دیتا ہے۔ وہ طالب علم بیوقوف ہے۔ اِدھر اُدھر کے کام بخوشی کر دیتا ہے۔ بازار سے چیزیں سستی خرید لاتا ہے۔"

شیطان چاء کی جگہ نہ جانے کس نشہ آور چیز کی پتیاں لے آئے۔ پی کر خمار سا چڑھ گیا۔ جب واپس روانہ ہوئے تو سب ایک دوسرے سے بے زار تھے۔ شیطان بیزار بھی تھے اور تھکے ہوئے بھی۔

”میرے دہنے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔“ سفینہ بولی۔

”میرے بھی دہنے پاؤں میں درد ہے۔“ شیطان نے جواب دیا۔

”میرے کان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔“ نئی لڑکی بولی۔

”میرے کان میں بھی بالکل ویسا ہی ہوتا ہے۔“

”میرے۔۔۔۔“ رحیمہ نے شروع کیا۔

”جی میرے بھی۔۔۔“ شیطان جلدی سے بولے۔

گھر پہنچ کر میں نے شیطان سے کہا کہ یہ چھوٹے موٹے سیکنڈ ہینڈ معاشقے انہیں زیب نہیں دیتے۔ انہوں نے قصوروار رضیہ کو ٹھہرایا۔ ہر لڑکی پر وہ اس لئے عاشق ہو جاتے ہیں کہ انہیں رضیہ کی محبّت نہیں مل سکی۔ دراصل ہر معاشقے میں انہیں رضیہ ہی کی محبّت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نہایت دلدوز انداز میں یہ شعر پڑھا۔

تجھ سے چھُٹ کر اوروں سے بھی جھوٹا سچا پیار کیا

وہ بھی تیرے عشق کے حیلے، یہ بھی تیرے غم کے بہانے

جج صاحب کے ولایت جانے کی افواہ خبر میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ عنقریب پاسپورٹ بنوانے والے ہیں اور انہوں نے بڑی کار فروخت کر دی ہے۔ باہر سے کوئی نیا ماڈل لائیں گے۔ بیگم کے لئے ایک نہایت چھوٹی سی کار خریدی گئی تھی جو دراصل اسسٹنٹ کار تھی۔ ننّھے میاں ضد کر کے اسے سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کرتے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ اس کار کے لئے ایک سائڈ کار بھی خریدی جائے۔

شیطان کا دن بدن حال بُرا ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جج صاحب جائیں نہ جائیں رضیہ ضرور ولایت جائے گی۔ اور پھر وہیں رہ جائے گی۔ انہوں نے بڑی منّتوں کے بعد مجھے سراغ لگانے بھیجا۔ بیگم کمرے صاف کروا رہی تھیں۔ "سارے روشن دان کھول دو تا کہ گرد نکل جائے۔ یہ بوروں کی کوئلی بھی اٹھاؤ اور خالی بوتے کی سوڈلیں یہاں کیا کر رہی ہیں؟ یہ سب کچھ یہاں سے نکالو (چونک کر) کیا وہ لڑکا آیا تھا ابھی۔۔۔؟"

اور میں چپکے سے پردے کے پیچھے ہو گیا۔ رضیہ کے کمرے میں پہنچا۔ "سُنا ہے کہ تم ولایت جا رہی ہو؟"

"ولایت تو نہیں عرب جانے کا ارادہ ہے۔"

"اور ہم؟ ہم یہیں رہ جائیں کیا؟"

"میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے گایا کیجئے۔"

"اور عرب کے بعد کیا پروگرام ہو گا؟"

"نمازیں پڑھایا کروں گی۔ اذانیں دوں گی۔ وعظ کیا کروں گی۔"

"ارے مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ لڑکا کہاں چلا گیا؟" بیگم کی آواز آئی۔

"لڑکا مراقبے میں ہے۔" میں نے بالکل آہستہ سے جواب دیا۔

جب میں رات گئے شیطان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اونگھ رہے تھے۔ جب ان پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ ان سے اگر سنجیدہ گفتگو کرنی ہو تو میں ہمیشہ یہی وقت چُنتا ہوں۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے تینوں لڑکیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ شاید شام کو اُنہیں کزنوں کے ساتھ دیکھ آئے تھے ان کی باتیں سُن آئے تھے۔

"لیکن اس کے باوجود ہم ان سے راہ ورسم رکھیں گے۔ مجھے تم سے بڑی شکایت ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"عہد جو کر چکا تھا۔"

"خیر۔ رضیہ کی خبر سناؤ۔"

"وہ کہیں نہیں جا رہی۔"

"سچ مچ؟" اُنہوں نے آنکھیں ملیں اور جیب سے عینک نکالی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی پرانی عینک تھی جو کھوئی گئی تھی۔

"ایک مرتبہ رضیہ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھّے معلوم ہوتے ہیں۔"

"اس نے تو یہ کہا تھا۔ کاش کہ آپ عینک کے بغیر اچھّے معلوم ہوتے۔ تم نے اچھّی طرح سُنا نہیں۔"

انہوں نے عینک صاف کر کے لگائی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ محبّت نام ہے غلط فہمی کا کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی سے مختلف ہے۔ مگر رضیہ کے لئے میرے دل میں وہی خیالات ہیں جو پچھلے ہفتے تھے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ یہ کہیں سمندر پار نہ چلی جائے۔ یہاں کم از کم اُسے دیکھ تو لیتے ہیں۔ اور اب جبکہ بہار ختم ہو رہی ہے

خوشیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ جب بہار ختم ہونے لگتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بڑھاپا آرہا ہے۔"

"مگر تمہارا چہرہ تو۔"

"یہ چہرے کا نہیں دل کا بڑھاپا ہے۔" وہ سینے پر مکّہ مار کر بولے۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر آنکھیں موند لیں اور بڑبڑانے لگے۔ "اور اگر میرے پاس کار ہوتی، تانگہ ہوتا، کرائے کی سائیکل ہوتی، میرے بال گھنگھریالے ہوتے۔، آنکھیں نشیلی ہوتیں تو وہ تینوں لڑکیاں مجھ پر عاشق ہو جاتیں۔ لیکن اگر یہ ساری خوبیاں مجھ میں ہوتیں تو میں کسی بہتر لڑکی کو اپنے اوپر عاشق کرواتا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر یہ جھوٹ بولتی رہی ہیں تو میں کون سا سچ بولتا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے فلرٹ کیا ہے تو میں نے بھی تو فلرٹ کیا ہے۔ مجھے ان کی پروا کب تھی۔ بس ذرا افسوس ہے تو اس بات کا کہ وہ مجھ سے زیادہ چُست نکلیں اور جو سلوک میں ان سے آخیر میں کرتا وہ انہوں نے مجھ سے ذرا پہلے کر دیا۔ ہم لوگ کتنے عجیب ہیں؟ سیدھی سادی لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ صرف شوخ و شنگ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دراصل ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ چالاک بن جائیں۔ جھوٹ بولنا سیکھ جائیں۔ ہم خود اُنہیں ایسا بناتے ہیں۔ یہ

سارے حربے ہمارے سکھائے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ سب کچھ سیکھ جاتی ہیں تو ہم انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور کچھ دنوں کے لئے پھر سیدھی سادی لڑکیوں کے قصیدے گانے لگتے ہیں۔"

مجھے علم تھا کہ بہار ختم ہو چکی ہے۔ شیطان کی کھوئی ہوئی عینک مل گئی ہے۔ ان کی غنودگی بھی کبھی کی دُور ہو چکی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شاید سچ بول رہے تھے۔

ملکی پرندے اور دوسرے جانور

کوّا

کوّا گرائمر میں ہمیشہ مذکّر استعمال ہوتا ہے۔

کوّا صبح صبح مُوڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ایسا مُوڈ جو کوّے کے بغیر بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ علی الصبح کتّے کا شور انسان کو مذہب کے قریب لاتا ہے اور نروان کی خواہش شدّت سے پیدا ہوتی ہے۔

کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔

کوّے کالے ہوتے ہیں۔ برفانی علاقے میں سفید یا سفیدی مائل کوّا نہیں پایا جاتا۔ کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔

پہاڑی کوّا ڈیڑھ فٹ لمبا اور وزنی ہوتا ہے۔ میدان کے باشندے اس سے کہیں

چھوٹے اور مختصر کوّے پر قانع ہیں۔ کوّے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن پہاڑی کوّا توباقاعدہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوّے سے حجم میں زیادہ ہوتا ہے۔

کوّے کا بچپن گھونسلے میں گزرتا ہے جہاں اہم واقعات کی خبریں ذرا دیر سے پہنچتی ہیں۔ اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گزار دے۔ لیکن سوشل بننے کی تمنّا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے۔ جو کوّا ایک مرتبہ شہر میں آجائے وہ ہرگز پہلا سا کوّا نہیں رہتا۔

کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں دیکھا جائے۔ کوّا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اُڑ کر جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے۔ چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کون نہیں چاہتا؟

کبھی کبھی کوّے ایک دوسرے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دراصل ایک کوّا دوسرے کوّے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے پرندوں کی طرح کوؤں کے جوڑے کو بھی چہلیں کرتے نہیں دیکھا گیا۔ کوّا کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ یا کرتا ہے؟ کوّے کو لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں۔ سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ لوگ تو بس ظاہری

رنگ روپ پر جاتے ہیں۔ باطنی خوبیوں اور کیریکٹر کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کوّا کوئی جان بوجھ کر تو سیاہ نہیں ہُوا۔ لوگ چڑیوں، مرغیوں اور کبوتروں کو دانہ ڈالتے وقت کوّوں کو بھگا دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح نہ صرف کوّوں کے لاشُعور میں کئی ناخوشگوار باتیں بیٹھ جاتی ہیں بلکہ ان کی ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آخر کوّوں کے بھی تو حقوق ہیں۔

کوّا باورچی خانے کے پاس بہت مسرور رہتا ہے۔ ہر لحظے کے بعد کچھ اُٹھا کر کسی اور کے لئے کہیں پھینک آتا ہے اور پھر درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آ جاتے ہیں۔ اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوّے نہاتے ہیں لیکن حفظانِ صحت کے اصولوں کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ کوّا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے۔ کوّے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

کوّا بڑی سنجیدگی سے اُڑتا ہے، بالکل چونچ کی سیدھ میں۔ کوّے اُڑ رہے ہوں تو

معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اُڑ رہے ہیں۔ کوّے فکرِ معاش میں دُور دُور نِکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھوئے نہیں جاتے۔ شام کے وقت کوئی دس ہزار کوّا کہیں سے واپس آ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط کوّے ہوں۔

کوّا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا میں اور آپ سمجھتے ہیں۔ شاعروں نے اکثر کوّے کو مخاطب کیا ہے۔ کاگا لے جا ہمارو سندیس۔۔۔ کاگا رے جارے جارے۔۔۔۔

لیکن ہمیشہ کوّے کو کہیں دُور جانے کے لئے کہا گیا ہے۔ کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔ بلکہ ایک شاعر تو یہاں تک کہہ گیا کہ۔۔۔ کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس۔۔۔ یہاں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جانیں اور آپ کاگا۔

اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو مت بھولیے کہ کوّے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

بُلبُل

بُلبُل ایک روایتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے سوائے وہاں کے جہاں اسے ہونا چاہیے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں یا باہر بُلبُل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ ہم ہر خوش گلو پرندے بُلبُل سمجھتے ہیں۔ قصور ہمارا نہیں ہمارے ادب کا ہے۔

شاعروں نے نہ بُلبُل دیکھی ہے نہ اُسے سُنا ہے۔ کیونکہ اصلی بُلبُل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ سُنا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بُلبُل ملتا ہے لیکن کوہ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں پائے جاتے۔

سائینٹ وہ نظم ہوتی ہے جسے محض بُلبُل کے لئے لکھا گیا ہو۔ خوش قسمتی بُلبُل اَن پڑھ ہے۔

عام طور پر بُلبُل کو آہ وزاری کی دعوت دی جاتی ہے اور رونے پیٹنے کے لئے اُکسایا جاتا ہے۔ بُلبُل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔ ویسے بُلبُل ہونا کافی مضحکہ خیز ہوتا ہو گا۔

بلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بُلبُل کو نالہ و شیون کرتے دیکھا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بُلبُل ہے اور وہ چیز نالہ و شیون در اصل رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔

بُلبُل پیروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے۔ لیکن اگر پیروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بُلبُل نہیں بچتی۔

بُلبُل کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ بُلبُل رات کو کیوں گاتی ہے، پرندے جب رات کو گائیں تو ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے۔ وہ اتنی رات گئے باغ میں اکیلی کیوں جاتی ہے۔ بُلبُل کو چہچہاتے سُن کر دور کہیں ایک اور بُلبُل چہچہانے لگتی ہے۔ پھر کوئی بُلبُل نہیں چہچہاتی وغیرہ۔۔۔۔۔ ہمارے ملک میں تو لوگ بس سکینڈل کرنا جانتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی چیز کا یقین نہ کیجئے۔

"کبھی کبھی بُلبُل غلطیاں کرتی ہے۔ لیکن اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی۔ چنانچہ پھر غلطیاں کرتی ہے۔ سیاست میں تو یہ عام ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بُلبُل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے، جس کی وجہ یہ ہر وقت کا گانا ہے۔ دراصل بُلبُل ہمیں محظوظ کرنے کے لئے ہرگز نہیں گاتی۔ اسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بُلبُل گاتے وقت بُل۔۔۔بُل۔۔۔۔بُلبُل۔۔۔۔بُل کی سی آوازیں نکالتی ہے۔ یہ غلط ہے۔

بُلبُل پکّے راگ گاتی ہے یا کچّے؟ بہر حال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی۔ بے سُری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ ساز والے نکمّے ہیں۔ آج گلا خراب ہے۔ آپ تنگ آ جائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں۔۔۔۔ اور کیا چاہیے۔

جہاں تیتر 'سبحان تیری قدرت'، پپیہا 'پی کہاں' اور گیدڑ 'پدرم سلطان بود' کہتا ہُوا سُنا گیا ہے وہاں بُلبُل کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصرعے کے ایک حصّے پر اٹک گئی ہو۔ مثلاً مانا کہ ہم پر جور و جفا جور و جفا جور و جفا۔۔۔۔۔۔۔۔ یا تعریف اُس خُدا کی، خُدا کی، خُدا کی۔۔۔۔ اور دلے بفر و ختم بفر و ختم بفر و ختم۔۔۔ شاید اسی میں آرٹ ہو۔

ہو سکتا ہے کہ ہماری توقعات زیادہ ہوں۔ لیکن یہ گانے کا ریکٹ اس نے خود شروع کیا تھا۔ بُلبُل کو شروع شروع میں قبول صورتی، گانے بجانے کے شوق اور نفاست پسندی نے بڑی شہرت پہنچائی۔ کیونکہ یہ خصوصیات دوسرے پرندوں میں یکجا نہیں ملتیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت جاتی رہی اور لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اِدھر بُلبُل پر نئی نئی تحریکوں اور جدید قدروں کا اتنا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بُلبُل سو فیصدی رجعت پسند ہے۔ کچھ لوگ اس

زمانے میں بھی بُلبُل کے نغموں، چاندنی راتوں اور پھولوں کے شائق ہیں۔ یہ لوگ حالاتِ حاضرہ اور جدید مسائل سے بے خبر ہیں اور سماج کے مفید رکن ہرگز نہیں بن سکتے۔ وقت ثابت کر دے گا کہ۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقلِ وطن کرتے ہیں۔ بُلبُل کبھی سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔

ہمارے ادب کو دیکھتے ہوئے بھی بُلبُل نے اگر اس مُلک کا رُخ کیا تو نتائج کی ذمّہ دار خود ہوگی۔

بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں۔ وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھینس کا وجود بہت سے انسانوں کے لئے باعثِ مسرّت ہے۔ ایسے انسانوں کی زندگی میں بھینس کے علاوہ مسرّتیں بس گنی گنائی ہوتی ہیں۔

بھینس کا ہم عصر چوپایہ گائے دنیا بھر میں موجود ہے لیکن بھینس کا فخر صرف

ہمیں ہی نصیب ہے۔ تبّت میں گائے کے وزن پر سُرا گائے ملتی ہے۔ سُرا بھینس کہیں نہیں ہوتی۔

جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ افریقہ میں بھینس سے ملتی جُلتی کوئی چیز بِزن ہوتی ہے۔ مگر وہ دُودھ نہیں دیتی۔ جغرافیہ دان اتنا نہیں سمجھتے کہ جو چیز دُودھ نہ دے بھلاوُہ بھینس جیسی کیونکر ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھینس اتنی ہی بے وقوف ہے جتنی دکھائی دیتی ہے یا اس سے زیادہ۔ کیا بھینس ایک دوسرے سے محبّت کرتی ہیں؟ غالباً نہیں۔ محبّت اندھی ہوتی ہے مگر اتنی اندھی نہیں۔

بھینس کے بچّے شکل و صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں۔ لہٰذا فریقین ایک دوسرے پر تنقید نہیں کر سکتے۔

بھینس سے ہماری محبّت بہت پرانی ہے۔ بھینس ہمارے بغیر رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو کوٹھی ملتی ہے تو ایسی جس میں گیراج تک نہیں ہوتا جہاں بھینس باندھی جا سکے۔

جس گھر میں بھینس ہو (اور بھینس کہاں نہیں ہے) وہاں اندرونِ حویلی سب کے سب بھینس کے چکنے اَونٹے ہوئے دُودھ کے لمبے لمبے گلاس چڑھاتے ہیں۔ پھر

خمار چڑھتا ہے کائنات اور اس کا کھیل بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایک اور دنیا کے خواب نظر آتے ہیں۔ رہ گئی یہ دُنیا، سو یہ دُنیا تو مایا ہے مایا!

کئی بھینسیں اتنی بھدّی نہیں ہوتیں، مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دُور سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ بھینس اِس طرف آ رہی ہے یا اُس طرف جا رہی ہے۔ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر۔۔۔ والا شعر یاد آ جاتا ہے۔

بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید چھریری ہو سکتی تھی۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لوگ مکمل احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بھینس کا مشغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا۔ وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے اُفق کو تکتی رہتی ہے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچتی۔ اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کِس بات کا تھا۔

ڈارون کی تھیوری کے مطابق صدیوں سے ہر جانور اسی کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکے۔ یہاں تک کہ بندر انسان بن گئے ہیں۔ بھینس نے محض سُستی کی وجہ سے اس تگ و دو میں حصّہ نہیں لیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ارتقائی دور ختم ہو چکا کیونکہ انسان بالکل نہیں سُدھر رہا۔ بھینس یہ سب نہ جانتی ہے نہ

جاننا چاہتی ہے۔ اگر معلّمین اسے نقشوں اور تصویروں کی مدد سے سمجھانا چاہیں تب بھی بے سُود ہو گا۔

بھینس کا حافظہ کمزور ہے۔ اسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

اگر بھینس کی کمر میں پتھر یا لٹھ آ لگے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ ذرا سی کھال ہلا دیتی ہے بس۔۔۔۔ اسے فلسفۂ عدم تشدّد کہتے ہیں۔

بھینسے کو بالکل نکمّا سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی سکیم ناکامیاب رہی کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہوا اور اَزلی سُست ہے۔ اس نے بچپن میں بھینس کا دُودھ پیا تھا۔

کبھی کبھی بھینسا چہرے کی جھریوں کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے۔ اور سینگ کٹا کر کٹوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حرکت کون نہیں کرتا۔

بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلّی بخش نہیں نکلتا۔ بھینس کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کبھی کبھی مجھ پر مُوڈ آتے ہیں جب میں گائے بکری وغیرہ کو بھینس جیسا سمجھنے

لگتا ہوں۔

اُلّو

اُلّو بُردبار اور دانش مند ہے لیکن پھر اُلّو ہے۔

وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات دوسری ہیں۔ اُلّو کا ذکر پرانے بادشاہوں نے اپنے روزناموں میں اکثر کیا ہے لیکن اس سے اُلّو کی پوزیشن بہتر نہیں ہو سکی۔

اُلّو کی بیس قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں پانچ چھ قسمیں کافی تھیں۔ ویسے اُلّوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ایک اُلّو کو دیکھ لینا تمام اُلّوؤں کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

اُلّو کو وہی پسند کر سکتا ہے جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مداح ہو۔ روزمرّہ کے اُلّو کو بُوم کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑے کو چُغد۔ چُغد سے بڑا اُلّو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

پالتو اُلّو وہ لوگ رکھتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کو پالنے کے عادی ہوں۔ اُلّو کی شکل و صورت میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ

ایک اُلّو دوسرے اُلّو کو کیونکر بھاجاتا ہے۔

دن بھر اور آرام کرتا ہے اور رات بھر ہُو ہُو کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہو سکتا ہے جتنا کہ آپ کا۔۔۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اُلّو تُو ہی تُو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ اُن خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہر وقت میں ہی میں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

شوخ اور باتونی پرندوں میں اُلّو کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ وہ چپ چاپ رہتا ہے۔ اور غالباً حِسِّ مزاح سے محروم ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لئے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مُسکراتے۔

اُلّو یہ انتظار نہیں کرتے کہ کوئی ان کا تعارف کرائے۔ دیکھتے دیکھتے یوں بے تکلّف ہو جاتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ شریکِ حیات منتخب کرتے وقت اُلّو طبیعت شکل و صورت اور خاندان کا خیال نہیں رکھتے۔ تبھی وہ صدیوں سے ویسے کے ویسے ہیں۔

مادہ ننّھے اُلّوؤں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوئے اور ان کی شکل اپنے ابّا سے ملنے لگی، انہیں باہر نکال دیتی ہے۔

اُلّو کو اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب

بے سُود ہے۔

اُلّو دوسرے پرندوں سے میل جول کو اچھّا نہیں سمجھتا۔ وہ اپنا وقت اور زیادہ اُلّو بننے میں صرف کرتا ہے۔ آپ کام سو مہا کام۔۔۔ اُلّو کا مقولہ ہے۔

اُلّو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثالی توہم پرستی میں اُلّو نے قابلِ تقلید حصّہ لیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اِس غریب اُلّو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت پر رہتا ہے۔ اُلّو کی نحوست ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔

اُلّو اچھّے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اچھّے تو وہ ہوتے ہیں جو دُور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلّوؤں کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولیے کہ انہوں نے اُلّو بننے کی التجا تھوڑا ہی کی تھی۔

ماہرین غور کرتے رہتے ہیں کہ اُلّو ہمیشہ تنہا کیوں نکلتا ہے؟ اُلّوؤں کا جوڑا باہر کیوں نہیں نِکلتا؟ ماہرین کو یہ بھی ڈر ہے کہ اُلّو دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں، کہیں نایاب نہ ہو جائیں۔ انہیں فکر نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی چیزیں کبھی نہیں مٹتیں، یہ ہمیشہ رہنے کے لئے آتی ہیں۔

ویسے اُلّوؤں کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ بات نہیں رہے گی۔ اُلّو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے تو اس کی نیّت آپ کو پریشان کرنے کی نہیں ہو گی۔ آپ بھی تو اُسے گھور رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں وہ زبان ہلائے بغیر آپ کو اپنا ہم خیال بنائے گا۔ اسے ہپناٹزم کہتے ہیں۔

اُلّو کی تلاش میں آپ کو زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔ اُلّو آپ کے قیاس سے کہیں قریب ہے۔ انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں اُلّو سے زیادہ بُری چیزیں بھی ہیں۔۔۔۔ دو اُلّو۔

اُلّو اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قدرت ایک مرتبہ کچھ ٹھان لے تو اسے پورا کر کے رہتی ہے۔

اس ساری لے دے کے باوجود اُلّو کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔

بِلّی

بلّیاں سلطنتِ برطانیہ کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بلّیوں پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔

بلّیوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جو لوگ بلّیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں ان کی

بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلّیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ بلّی انہیں خواہ مخواہ چاہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بلّی کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔

بلّیاں دو ہفتے کی عمر میں ناز و انداز دکھانا شروع کر دیتی ہیں بغیر کسی ٹریننگ کے۔ سُنا ہے کہ کچھ بلّیاں دوسری بلّیوں سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ سیامی بلّی کو حسین سمجھتے ہیں (ایسے لوگ کسی چیز کو بھی حسین سمجھنے لگیں گے۔) انگورا کی بلّی کی جسامت اور خدوخال کتّے سے زیادہ ملتے ہیں۔ ویسے ایرانی بلّی ایک اچھی آل راؤنڈر بلّی کہی جا سکتی ہے۔

ایران میں ایرانی بلّیوں پر غیر ملکی بلّیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سودیشی بدیشی کا سوال ہر جگہ ہے۔

ایرانی بلّی بھی تماشہ ہے۔ کبھی گُربہ مسکین بن جاتی ہے اور کبھی نہ بنی کہ چُوں گُربہ عاجز شود۔۔۔ شاید ایرانیوں نے اپنی بلّی کو نہیں سمجھا یا شاید سمجھ لیا ہے۔

بلّیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں۔ قنوطی بلّی می ی ی آؤؤں کہتی ہے تا کہ ہر ایک سُن لے۔ جب بھی زیرِ لب بڑبڑانا شروع کر دے اور تنہائی میں دیر تک بڑبڑاتی رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے بہترین دن گزار چکی ہے۔

گرمیوں میں بلّیاں پنکھے کے نیچے سے نہیں ہلتیں۔ سردیوں میں بن ٹھن کر، ربن بندھوا کر، دُھوپ سینکتی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد یہی ہے۔ بلّی کا بورژوا پن نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لئے مہلک ہے۔ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بلّی کے لئے مفید ہے وہ سب کے لئے مفید ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ بلّیاں اتنی مغرور اور خود غرض کیوں ہیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو محنت کئے بغیر ایک مُرغّن غذا ملتی رہے، جس میں پروٹین اور وٹامن ضرورت سے زیادہ ہوں تو آپ کا رویّہ کیا ہو گا؟

بلّی دوسرے کا نکتۂ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں تو اس کا پہلا سوال یہ ہو گا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

سال بھر میں بلّی سِدھائی جا سکتی ہے۔ مگر سال بھر کی مشقت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلّی ہو گا۔ جہاں بقیہ چوپائے دُودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہیں وہاں بلّی دُودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے دُودھ کھلا رہ جائے تو آپ کی سِدھائی ہوئی بلّی پی جائے گی۔ اگر دُودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی۔ کیونکر؟ یہ ایک راز ہے جو بلّیوں تک

محدود ہے۔

شکی لوگ بلّیوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ بلّیاں کیا کریں؟ ان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب انہیں خود پر اعتبار نہیں رہتا۔

بلّی کو بلانے کے لئے پُوس پُوس، مانو بانو یا پُسی پُسی جیسے مہمل اور غیر مہذب کلمات استعمال کیے جاتے ہیں اور بلّی پھر بھی نہیں آتی۔ کبھی کوئی بلّی خواہ مخواہ ساتھ ہو لیتی ہے جہاں جاؤ پیچھا کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بلّیاں پیار سے پنجے مارتی ہیں اور بھی چند وجوہات کی بنا پر 'غیر بلّی' نہیں سمجھتے کاٹ بھی لیتی ہیں۔ شکر ہے کہ بلّی کے کاٹے کا علاج آسان ہے۔ اس کا کاٹا پاگل نہیں ہوتا۔

بلّیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دوسرے کا مُنہ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔

بلّی اور کتّے کی رقابت مشہور ہے۔ بلّی برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی وفادار دوست ہو۔ بلّی میں برداشت بہت کم ہوتی ہے۔

بلّی اپنی کمر کو خم دے کر بہت اونچا کر لیتی ہیں اور دیر تک کئے رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ تو وہی جانتی ہوں گی۔ مگر وہ جو کچھ کرتی ہیں اکثر غلط ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس طرح وہ گیئر بدلتی ہوں۔

جب بلّی چاند کی طرف دیکھ کر بُری طرح رونے لگے تو روئے سخن آپ کی طرف یا میری طرف نہیں۔ یہ سب کسی اور بلّی کے لئے ہے۔

چند بلّیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کر سکتی ہیں۔ چوہے تو دفع ہو جائیں گے۔۔۔ مگر بلّیاں رہ جائیں گی۔ بلّیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں۔ ان کی جلد پر طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں۔ موٹی بلّیاں اپنے جسم پر لمبائی میں سیدھی دھاریاں بنالیں تو ان کا مٹاپا چھپ سکتا ہے اور وہ چھریری اور کیوٹ معلوم ہوں گی۔

بلّیاں دوپہر کو سو جاتی ہیں وہ رات تک انتظار نہیں کر سکتیں۔ بعض اوقات بظاہر سوئی ہوئی بلّی اِدھر اُدھر دیکھ کر چُپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس سے باز پرس کی جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ بلّی کی جگہ کوئی بھی ہو تو خفا ہو جائے گا۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال گزارنے کے باوجود انسان اور بلّی اجنبی رہتے ہیں۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔

بلّی سامنے سے گزر جائے تو لوگ خوشخبری کا انتظار کرتے ہیں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے میں کسی کام جارہا تھا اسی طرح بلّی بھی کہیں جارہی ہو گی۔

اندھیرے میں کالی بلّی کا نظر آ جانا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے پتہ نہیں بد قسمتی کیا ہوتی ہو گی۔

خیر جو کچھ بھی ہو ہم سب کی تقدیر میں بلّی لکھی ہے۔ اپنی بلّی سے بچنا محال ہے۔ کوئی دلیر ہو یا بزدل، عقل مند ہو یا احمق، کسی نہ کسی دن ایک بلّی اسے آ لے گی۔ ویسے ایرانیوں کا اصول رہا ہے کہ گربہ کشتن روزِ اوّل۔

میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ میں بلّیوں سے دُور رہتا تو بہتر تھا۔

سفر نامہ جہاز باد سندھی کا

بسم اللہ دیباچۂ فسانہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانہ، راست براست، بلا کم و کاست،یعنی تذکرۂ جہاز باد سندھی عفی عنہ۔۔۔

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدّت مدید و عرصہ بین کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوان نحیف و نزار (کہ جسے نوجوان سمجھنا نری خوش فہمی تھی) کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تھا۔ تخلّص سندھی اور لقب خورد۔ حلیہ اس کا فاقہ زدہ تھا اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی۔ شیو اس نے ہفتے بھر سے نہیں کروایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھّا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹلکچوئل طبقے سے متعلق تھا۔۔۔!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی۔ ملازم کو اگلے روز بخششیں دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ ایک عالی شان محل کے سامنے سے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جیسے خیالات کی روانی میں دفعتاً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حضرات بھی جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل ورکس کھول لیتے ہیں اور پروپرائٹر کہلاتے ہیں غائب غلّا ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کارآمد شے تھامے نمودار ہُوا۔ اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مسرّت سے چمک اُٹھی۔ اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دے دیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ تس پہ وہ مردِ توانا زیرِ مونچھ مُسکرایا (کہ اس کا چہرہ ایک چوڑی، سیاہ، گھنی اور عُمدہ مونچھوں سے مزیّن تھا) اور بولا۔ اے مردِ ناداں مزید کوشش عبث ہے کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہُوا۔ دروازے پر بورڈ پڑھا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لکھّا تھا۔۔۔ ''جہاز باد سندھی کلاں۔''۔۔

ذرا قریب گیا تو مرغانِ نوا سن کی زمزمہ پردازی دل کو لُبھانے لگی۔ ہزار و طوطی کی صدا آنے لگی۔ انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے دماغ طبلۂ عطّار بن گیا۔ ذرا سی دیر میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمۂ دِلرُبا اور رباب کی آوازِ خوش کانوں میں آئی ۔ طعمۂ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ بادۂ خوشگوار کی صراحی قلقل کی صدا سُنائی تھی۔ دیکھا کہ احبابِ بذلہ سنج اور خاتونانِ ذی مرتبہ رنگ رلیاں مناتی ہیں، جھولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے۔ مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بد طالع، بد بخت ہے۔ کوئی صاحبِ تاج و تخت ہے۔ اس مکان کے مکین پر بڑی عنایت ہے اور مجھے گنہگار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہِ فلک بارگاہ کا ایوانِ سپہرِ تو آمان ہے، یا روضۂ رمضان ہے۔ کہیں حُور ہے تو کہیں غلمان ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی مردِ قوّی مونچھ نے آ کر پیغام دیا ہے کہ صاحبِ مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا اسلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا۔۔۔ وعلیکم السّلام اور

روانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مرد قوّی ہیکل کہنے لگا کہ صاحبِ خانہ یاد فرماتے ہیں۔
جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحبِ مکان کوئی ماہرِ نفسیات ہے جس نے اتنی دور
سے میرا تجزیۂ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں
گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مونچھ مچھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر
لے گیا جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یا الٰہی اتنی خوبرو اور
گلبدن حسینان پُر فن، شوخ و شنگ، رشکِ گُل رخانِ فرنگ کیونکر ایک مقام پر
جمع ہیں۔

جہاز باد سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا۔۔ "اے معزّز اجنبی
حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹلکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔"

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں۔۔۔
"الحمدللہ یہ خاکسار بھی کبھی انٹلکچوئل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے
ہیں جو انٹلکچوئل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے۔ آپ ان سے ملئے۔"

سب خوب بغلگیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہاز باد خورد گُدگُدی سے بہت ڈرتا تھا۔
وہ عید کے روز چھپتا پھرتا۔ تاہم ایک موہوم سی امید پر اس نے بغل گیر ہونا
شروع کر دیا۔ لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا اور اس نے سُرخ لباس والی حسین

شہزادی سے بغلگیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی "آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی۔" جب دونوں جہاز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سُنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا سا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا۔ "یا پیر و مرشد ابھی سُورج نظر آتا ہے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے وہسکی سے گریز کرنا چاہیے۔ البتّہ بیئر وقت کی چیز ہے۔"

جہاز باد کلاں یہ تقریر سُن کر دم بخود رہ گیا۔ عش عش کرنا چاہتا تھا لیکن شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا اور یوں بولا "اے بامذاق انسان! بیئر کا گلاس نوشِ جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ۔ تیری سائیکل ہم نے مرمّت کے لئے بھیج دی ہے۔"

ہو الشّافی کہہ کر وہ جام جہاز باد خورد نے پیا اور دوسرا انڈیلنے لگا۔ جہاز باد کلاں نے اس کی جانب شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "اے نوجوان سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولیو کہ یہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشمِ زدن میں صاحبِ دولت و جاہ کرے اور قارون سے مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہہِ خاک و تباہ کر دے۔ تو ضرور

حیران ہو گا کہ یہ نعمتیں ہمیں کیونکر میسّر آئیں۔ یہ فرمانبر دار بہرے ہیں جنہیں سُنائی بھی دیتا ہے۔ یہ افرنگی بئیر جو غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے۔ یہ پُر رونق محفلیں۔ یہ سب کچھ ہمیں یونہی نہیں ملا۔۔۔ ہم۔۔"

"واحد متکلّم صیغہ استعمال کیجئے۔" ۔ایک طرف سے آواز آئی۔

"معاف کیجئے تو اس کے لئے مجھے کیا کیا مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ اس کا ذکر میں ابھی سُناؤں گا۔"

محفل میں یکلخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ کسی کو ضروری کام یاد آ گیا۔ کسی نے کہا ابّا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔ کوئی بولا یہ کہانی اتنی مرتبہ سُنی ہے کہ زبانی یاد ہو چُکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز باد کلاں نے خورد کے لئے چوتھا گلاس اُنڈیلا۔ کباب سامنے رکھے اور یوں کلام کیا۔۔۔

جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

خشتِ اوّل چوں نہر معمار کی

تا ثریّا میر ود معمار کج

”اے میرے معزز ہم نام تونے ان شہزادیوں کی میناچشمی دیکھی؟ حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہیں آیا۔ یہ بیئر پھُسی پھُسی معلوم ہوتی ہے، نئی بوتل کھول اور خُدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ۔“

”اے میرے محترم ہم نام، اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔۔۔“

”یہ ان دنوں کا ذکر ہے۔“کلاں گویا ہوا”کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ اُن دنوں جے۔ باد سندھی کہلاتا تھا۔ بعد میں جے۔ بی۔ سندھی ہو گیا۔ اُس علاقے میں کئی اور جے۔بی۔ سندھی بھی تھے۔ چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ ناچیز کو فنونِ لطیفہ، فنونِ لطیفہ شناسی، فنونِ حرب و ضرب، فنونِ جمع تفریق میں خاصی شُدبُد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شُدھ سارنگ، شُدہ کلیان، شُدھ مکر دھوج سب بخوبی گا سکتا تھا۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بھیڑیے کو السیشن کتّا سمجھ کر پکڑ لیا اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لیے پھرا، جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک بھیڑ کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔ سیب کے درخت کو تبھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر سارے پودے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیبِ دوستان علیل ہوا تو

طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا۔ ایک مرتبہ سُرمہ ملنے پر حکیم ہی سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لُغّت میں قیلولے کے معنی دیکھے تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ برسوں دوپہر کے کھانے کے بعد سویا کیا لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی سی حرکت کے نتائج قیلولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں کہ قاف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے۔ جب فارغ التعلیم ہُوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جاں نثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجوع کیا اور رات دونی، دن چوگنی ترقّی نصیب ہوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر جوتا چلا۔ کئی اخبارات ضبط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے دو جگری دوست تھے جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ لیکن فلک کی رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں تمام ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں خود غرض دنیا مجھے بھول گئی۔ محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔۔۔"

"تو کیا آپ کے دو دوست داعی اجل کو لبیک کہہ اٹھے۔۔۔؟"

"نہیں! ان میں سے ایک تو ضلعدار بن گیا اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سوئم۔ کُچھ دنوں کے لئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی۔ پھر شاعری کا شوق چرایا۔ محروم تخلّص کیا۔ غزل میں ترنّم کا یہ عالم تھا کہ ہر شعر کی دُرت لَے پر بھی تین تالہ بج سکتا تھا اور ولمپت لَے پر بھی۔ غزل کے لئے طبیعت غیر حاضر ہوئی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا۔ خُدا کا کرنا کیا ہوا کہ محل سرا کے باہر جو اس خاکسار کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چُرا لیا۔ دروازہ نئے بورڈ سے مرصع کیا گیا۔ مجھے بغرض تبدیلی آب و ہوا خانیوال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا۔ یہ سب تعزیت نامے تھے۔ حیران تھا کہ کِس نے کِس کی جانِ آفریں کِس کے سپرد کی؟ جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے محروم کی جگہ مرحوم لکھ دیا تھا۔ اسی روز بورڈ بدلا لیکن شہر بھر میں رُسوا ہو چکا تھا۔ سندھی تخلّص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ پھر سوچا کہ اے مردِ باہمّت، شاعری گئی تو کیا ہُوا اور بھی بہت سے مفید مشغلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے اور تو یہ عمر کبھی کی گزار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ۔ اور پیری مریدی کی طرف رُجوع کر۔ ایک دفعہ نام چمک اُٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس ناچیز نے اس سلسلے میں بڑا مطالعہ کیا۔ بہاولپور اور سندھ کے تکیوں میں بیشتر وقت گزارا۔ قابل فقیروں سے ٹریننگ حاصل کی۔

جھنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں چکر لکھّا تھا کہ کسی ایک لائن کو سٹک نہ کر سکا۔ ایک دن اتّفاق سے آلڈس ہکسلے، ورجینیا وُلف، برٹرینڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا اس لئے ورق گردانی پر مجبور ہو گیا۔ اچھا بھلا بیٹھا تھا کہ اچانک بشارت ہوئی کہ تو انٹلکچوئل ہے۔ اگرچہ یہ درِّ بے بہا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا۔ تاہم خاندانی انٹلکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور حلیے سے لاپرواہوتا چلا گیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف اُن کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا۔ قسمت کے لکھّے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی۔ ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا تو ایک پرندہ بالکل میرے سَر کے اوپر سے گزر گیا۔ یہ واہمہ نہ تھا۔ تشویش ہوئی۔ کیونکہ مقامی پرندے سست اور ڈرپوک تھے۔ اندھیرا ہو چکنے کے بعد بھی نظر نہ آتے۔ دل میں یہ شُبہ یقین پا گیا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ہُما تھا۔ اس مژدہ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے زندگی میں تسلّی بخش راحت ہے دنیا میں امن ہے اور میں انٹلکچوئل ہوں!

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بُری خبر سنائی کہ میں ساکن ہر گز نہیں ہوں۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں۔ فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑا جا رہا ہوں۔ سورج کے گرد ہر سال میں کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں۔ اِدھر کی گردش اُدھر کی گردش اس طرف اس طرف ہر طرف رواں دواں، میرے کانوں میں تیز ہوا سے شُوں شُوں ہونے لگی۔ چکّر پر چکّر آنے لگا۔ ٹھیکہ شراب دیسی، نامی دکان پر پہنچا (جہاں ہندوستانی شرفا بیٹھ کر پی سکتے ہیں) جب باہر نِکلا تو دنیا تاریک تھی۔ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی۔ دونوں کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مُردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری طور پر پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ اس غیر انٹلکچوئل ہجوم کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھّے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا (کہ خطاب جس نے پہلوان السندھ کا پایا تھا) وہ ایک ہاتھ ہُوا میں اُٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا پٹھّا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے عمِّ محترم کا ذکر نہیں کیا کہ گھر اس کا ایک

بیسویں صدی کی امریکن طرز کی محل سرائے تھی جس کا نقشہ ملک فرنگ کے ایک ذی فہم زیرک کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں (کہ اہلِ فرنگ کی صنّاعی و جادوگری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی جھومتی تھیں۔ وہ احتشام، وہ دبدبہ، وہ طمطراق تھا کہ انٹلکچوئل جب سامنے سے گزرتے تو مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ ویسے یہ مرد طرّار ناپ تول کا پُورا تھا۔ فنِ تراز و طرازی میں اس کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ اژدہام رہتا کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کُشتیاں ختم ہو گئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آ دبوچا۔ زور سے دھپ لگا کر بولا "سُنا بے گیدی، یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ مقام تیرا کافی ہاؤس اور مری نوجوانوں کی محفل ہے۔ ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس نہیں کرتا؟" یہ کہہ کر وہ پہلوانوں کے غول کے ساتھ سوئے ڈپو روانہ ہوا اور اس فقیر کو کمال خفت اُٹھانی پڑی۔ سوچنے لگا یہی مرد کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ ڈپو ملتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی مانگے شرم سے ڈوب مرے۔ اور اس پر اسکی گفتگو واللہ یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک پر دراز ہو جاؤں اور اپنے آپ کو جاں بحق تسلیم کروالوں۔

یکایک ایک صدائے روح پرور سُنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان (جو فقط ایک لنگوٹ سے مرصّع تھا) ڈھول پر رقصاں ہے۔ تِس پر اس خاکسار کے پاپوشوں کو حرکت ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی۔ یہاں تک کہ ضبط نہ رہا اور یہ حقیر اس قلندر خوش لباس کے پیچھے ہو لیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے کی کمر پر ایک بورڈ ہے۔ چشمِ زدن میں چشمہ (جو ماموں جان کے دھپ سے اتر گیا تھا۔) جیب سے نکالا۔ آہ سرد بھری جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار ہوئے۔ قمیص سے عینک صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی کہ بیان جس کا احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ بعد از مطالعہ انکشاف ہُوا کہ وہ ریڈیم ٹانک پلز کا اشتہار تھا۔

عمّ ِمحترم کا وہ طعنہ جو اِس ناچیز کی صحت پر کھلم کھلاّ حملہ تھا تیر کی طرح پیوست ہو چکا تھا۔ قصد انتقام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔

ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی۔ کیونکہ حقیقتاً اتنی چینی بچ رہی تھی جو اس کے احباب کے لئے درکار تھی۔ اس نے گاہک کو اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تُلا بیٹا تھا، کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کر دکان کی تلاشی لینے کا متلاشی ہُوا۔ عین اس

وقت جب وہ مفسد دکان کے اندر گیا۔ عمِّ محترم اپنی بیوک میں بیٹھ کر محل سرا پہنچا اور خواجہ سرا سے رختِ سفر بندھوا کر سرحد کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات پہلے سے مکمّل ہو چکے تھے۔ ماموں جان کو روک لیا گیا اور سرکاری مہمان خانے میں (کہ اس ملک میں جیل کہلاتا ہے) قیام و طعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکی تھیں۔ چنانچہ جب اُسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست بے حد عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لئے جان ہلکان کر لی جائے۔ آپ پہلوان الہند بھی بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ فاضل اجل علامہ اقبال فرما گئے ہیں۔۔۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔۔۔۔

میرا ماموں اس پر پھڑک اٹھا اور کہنے لگا "واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے؟ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہو گا۔"

"دوسرا مصرعہ اے محترم، عشق کے امتحانوں کے متعلّق ہے۔"

"واہ، تو عشق کے امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کون سی یونیورسٹی لیتی ہے؟"

میں نے اس مردِ جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گو یہ شخص عم اس ناشدنی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب پاسِ حکمِ خداوندی ہے مگر جہالت اس کے چہرے پر ہُن کی طرح یوں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

"عشق کے امتحانوں کے متعلّق کیا فرما گئے ہیں علّامہ؟" اس نے اصرار کیا۔

"یہ دوسرا مصرعہ اے عمِّ محترم آپ جیسے پیر فرتوتوں کے لئے نہیں۔ مجھ جیسے نوجوانوں کے لئے ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں؟" میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ستاروں سے قطعاً دلچسپی نہیں (وہ آہِ سرد کھینچ کر بولا) مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جارہا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی کا ٹھینگا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا۔ نہایت مترنّم آواز نِکلی جو کانوں کو بھلی معلوم ہوئی لیکن خودداری نے لعن و ملامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر اسٹیشن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے

مردِ مجہول کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لائے اور ریڈیم ٹانک پر کھانے اور مگدر گھمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ ڈنٹر پیلنے کے بعد تین گولیاں کھاتا۔ لنچ تک بیٹھکیں نکالتا۔ لنچ پر چار گولیاں، پھر ڈنٹر اور مگدر، رات کو پانچ گولیاں۔ ہفتہ گزرا ہو گا، یقین جانیے بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری سے اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیر ببّر پر سواری کی جائے۔ لنگوٹ کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس کے بعد خیال ہُوا کہ کیوں نہ عمِّ محترم کی خبر لی جائے۔ چنانچہ اسی لنگوٹ میں ماموں کے محل سرا پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں بسترِ استراحت پر بصد خضوع و خشوع دُعا مانگ رہے ہیں کہ اے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ ”تیری شان ہے کہ

جس کی ڈیوڑھی پر پیکارڈ اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹلکچوئل کی بد دُعا تو نہیں لگی۔۔۔"

"بس بس اے مرد بدبخت اُٹھ! میں نے تیرے فیل تن ہونے کا راز پا لیا ہے۔ اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو بُرا بھلا کہا ہے تو، خبردار جو کسی کو بھی بُرا بھلا کہا ہے تو۔ کیا ہم سب ایک جیسے نہیں؟ سب برابر نہیں؟ میں برابر ہوں برنارڈشا کے، برنارڈشا برابر ہے کنفیوشس کے، کنفیوشس مساوی ہے ابنِ بطوطہ کے۔"

"اے عزیز از جان بھانجے! آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے حق میں جو دُعا کی تھی۔ وہ میں واپس لیتا ہوں۔" اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ صحّت بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹلکچوئل پنا دوبھر دکھائی دینے لگا کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انہیں لوگ سمجھتے نہیں۔ ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے کیونکہ صحّت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے مشکل جواب سُن کر بورڈ کے ممبروں کو احساسِ کمتری ہو جاتا ہے اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پبلک حلیہ دیکھ کر ہی دوڑ جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے

کے اور کچھ میسّر نہیں آتا اور ہوا میں غذائیت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عید گاہ میں دو بزرگوں کو بغل گیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھینگے تھے مگر بلا کے انٹلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مُسکرائے، زیرِ لَب کلمات خوشگوار لائے اور ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو نعرے بلند ہوئے۔۔۔

"کہاں چلے گئے؟"

"میں تو یہاں ہوں اور تم؟"

"یہ رہا۔۔"

مُڑے اور بغلگیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے۔ لیکن اس مرتبہ پھر نشانہ خطا گیا۔ تیسری مرتبہ بغلگیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیاز مند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل اُستاد سے بغلگیر ہوتے وقت جو کمر پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دُم غائب تھی۔ جاگا تو عبث شرمندہ ہُوا۔ اسی دن سے میں نے انٹلکچوئل بننے بلکہ نیم انٹلکچوئل بننے سے کنارہ کشی کی۔۔ بھئی تو سُن نہیں رہا ہے۔ اُونگھ رہا ہے۔

"نہیں تو۔" جہاز باد خورد دفعتاً جاگا۔

"اچھی بتائیں میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"جہاد باد جندی، رہانہ بہادرِ ندی، نہاز باد نندی۔"

"معلوم ہوتا ہے یہ بئیر کا اثر ہے۔"

"ہرگز نہیں! یہ سفر ہی بہت لمبا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا۔ یا ہمدم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سر مبارک کے اُوپر سے گزرا؟"

"اے ہمدم نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پرندہ وہ بُوم تھا کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گزرا۔"

کرنا تمام پہلا سفر جہاز باد سندھی کلاں کا، رخصت ہونا جہاز باد سندھی خورد کا ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز، بغرض سماعت سفر دوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات شامل تھے، خورد اور کلاں۔ ہرچند اُستاد کلاں نے شہزادے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا۔ بارہا ٹیلیفون کیا لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چاء منگوائی۔ خورد چاء دیکھ کر نہایت

غمگین ہوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا۔۔۔ چاء را کن چاء در پیش۔۔۔ لیکن کلاں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور بولا:

جہاز باد سندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دوستی اچھی

اے عزیز از جان ہم نام ایک دن چوک میں میں نے ایک شخص کو ہجوم کے سامنے تقریر کرتے سُنا وہ کہہ رہا تھا کہ سب لوگ برابر ہیں، سب مرد برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں، سب کے ایک سے ہیں۔ لہٰذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے۔ بس میں سفر کے ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھئے اندھیرا ہو جانے پر اندر جایئے اور روشنی ہونے سے پہلے باہر نکل آیئے۔ میونسپلٹی نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کئے ہیں اور ان پر موسیقی (جو اسّی فیصدی فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سُنی جا سکتی ہیں۔ بُک سٹال پر کھڑے ہو کر ذرا سی دیر میں تازہ رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک لمبے سے اوور کوٹ سے سردیاں نکل سکتی ہیں اور دو رنگین بُش شرٹوں سے گرمیاں، ذرا سی خوشامد سے بآسانی محبّت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولیے کہ

سب لڑکے ایک جیسے ہیں اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں۔۔"

وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شُبہ سا ہوا۔ اگر چہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے۔ "اے ہمنام خورد تیرا روس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"اے ہمنام کلاں معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں۔ اگر چہ میں نے گراؤ چو مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب سرمایہ داری پڑھی ہے۔"

"نہیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے۔"

"تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہو گا۔ مارکس برادرز کو ماشاء اللہ کون نہیں جانتا۔"

خیر تو میں تقریر سُنتا رہا۔ اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی۔ معلوم ہُوا کہ اس پارٹی میں چند اور شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے دو تین شہزادیاں تو واللہ خوب تھیں۔ ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں۔ کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج نکالا۔ کسی نے بتایا کہ ان کے کچھ بچّے سبزی ہائے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچّوں کی بہبودی کے لئے از حد اشد ہیں۔ اُدھر بچّے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوتے نہیں۔ میں نے اُن حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں کچھ ٹماٹر بالائے طاق رکھے۔ شلجم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فرداً فرداً ملیں تو سمجھے کہ انہوں نے چرائی ہیں لہٰذا خوب سیر ہو کر کھائیں۔ بچّوں کے ابّا نہایت خوش ہوئے اور گلہِ اپنے پیارے کتّے کا کرنے لگے جو علیل تھا مگر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دوائی اس سگِ نابکار کے دہن میں انڈیلنا چاہی۔ جب اس نے متواتر نارضامندی کا اظہار کیا تو جھنجھلا کر شیشی فرش پر پٹخ دی۔ تس پر اس سگِ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے ”اے مردِ عاقل! تو دولتِ نفسیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے؟“

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل ہوتا۔ الحمدللہ کہ اس مردِ گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گزرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگریٹ کا ٹین کھولتا اور سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے جوتے روپیہ استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت معمولی اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سر پر ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔ واسکٹ اور چپلیوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا۔ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا، پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا، جہاں کوئی کھیل تماشہ ہو یا کسی تقریب میں بہت سے لوگ جمع ہوں وہاں شور و غل مچا کر رنگ میں بھنگ ڈال دینا۔ اس کے لئے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے للّٰہی بغض تھا۔ مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لئے ان لوگوں میں شریک ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ نہ سیکھ سکا۔ اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ خشک و تر کو یکساں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب نے خرمن صبر و شکیب پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیر اُن میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی۔ گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے اُن

کی رنگت سنولانے لگی۔ ہر جگہ پنکھوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کئی بار پنکچر ہوئی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ لوگ اَن پڑھ ہیں، سمجھتے نہیں۔ بلکہ اب تو لوگ ہم سے چِڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ نہیں ہو گا۔ پھر ایک روز ہم نے سُنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے۔ حالانکہ خان بہادر موصوف کی گزشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک رائے بہادر کو چُنا جو سب کی رائے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلّق افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ سرگباش ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھُولا تو یہ ناچیز ساری چوکڑی یک دم بھولا۔ لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پر بھروسہ کرنا دلیلِ حماقت ہے۔ اُن کی استقامت کا دم بھرنا عین جہالت ہے۔ یکایک تیسری شہزادی نے ایک دولتمند زمیندار سے عقد کیا جس نے فوراً دو مربّعے بیچ کر ایک پیکارڈ خریدی۔ الغرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے یہ لکھ کر بھیجا۔۔۔

ع جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جواب آیا

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے پیدا کیا

وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے۔ سوچنے کی آزادی، جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل و خوار کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سرِ بازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جا کر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترچھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی۔ دو مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا۔ میں نے آزادیٔ گفتار دکھائی تھی اور اس نے آزادیٔ کردار۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ یکایک آہ سُنائی دی۔ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ نمبر دو سُنی۔ دوسری بار حیران ہوا۔

"میں نے بھری ہے۔۔" گھوڑے نے بڑی سلیس اُردو میں کہا "اور میں کیوں نہ بھروں؟ میں بھی تو جاندار ہوں۔ مُنہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ ڈارون کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقاء کی مختلف منزلوں پر ہیں۔ ہمارا ماخذ ایک ہے۔ لٰہذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ اے میرے کزن میں تھک گیا ہوں اب تم گھوڑے بنو اور میں سواری کروں گا۔"

چار و ناچار اس حقیر کو گھوڑا بننا پڑا۔ باری باری ہم نے سواری کی، جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر رہتا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے نئے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہرِ نفسیات سے مِل کر آٹو سجیشن کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا اور بولا کہ ان دِنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہُوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا اور کوئی سواری میسّر نہ تھی۔ نقل و حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کر بُرا حال ہوا تو عقیدے بدلنے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی تتّر بتّر ہو گئے۔ کچھ

راجواڑوں میں جا بسے۔ ایک دو ایکٹر بن گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اُسے ہر وقت یہ وہم رہنے لگا کہ

ع شاید کہ پولیس خفیہ باشد

بعد میں سُنا کہ وہ بھی نائب تحصیلدار بن گیا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا۔ عزیز القدر ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھّر بن جائے۔ مجھے احساس ہے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ آج دیسی منگوائی ہے کہ چُلّو میں اُلّو کرتی ہے۔"

اگلے روز جب خاتونِ شب نے چادرِ سیاہ میں رُخ چھپایا اور شاہِ خاور نے اورنگِ سپہر پر جلوہ فرمایا (یعنی جب صبح ہوئی) تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا کہ ساتھ ان کے چند خرگوش بھی خوابیدہ تھے۔ آنکھ کھلنے پر غنچۂ صبح کھکھلایا۔ مرغانِ خوش الحان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لطفِ مزید پایا۔ جہاز باد کلاں شرمایا اور زبان پر یہ کلمے لایا۔۔۔

"اے مردِ نیک طینت! بادۂ دیسی نہایت تیز نکلا۔ اب تک حالت خستہ ہے۔ آج اچھّی طرح اس شعر کے معنے سمجھ میں آئے ہیں۔

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو

یہ کل کی پی ہوئی مَے کا خمار باقی ہے

یہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہوں گے۔، شاید تھانے میں پوچھنے گئے ہوں۔"

"میں خُدا کے فضل و کرم اور آپ کی دُعا سے ناکتخدا ہوں۔۔۔" خورد نے شرما کر کہا۔

"تو ملا ہاتھ، میں بھی ناخدا۔۔۔یعنی ناکتخدا ہوں، تو پھر سُناؤں تیسرا سفر؟"

"ذرا صبر فرمایئے، سمندِ کلام کو زیرِ لگام لایئے۔۔۔"

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سُنایا کہ چھوٹا حاضری تیار ہے۔ چاء پی کر کلاں ضبط نہ کر سکا اور یوں گویا ہُوا

جہاز باد سندھی کا تیسرا سفر

ے دل سے شوقِ رُخ نکو نہ گیا

تانکنا جھانکنا کبھُو نہ گیا

اے مردِ خالص! میں موسمِ سرما گزارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لئے عشرت افزا گُلشن اور درویشوں کے لئے دلکشا خلوت کدہ ہے۔ جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سُننے میں آیا۔ جس سے کان قطعی طور پر نا آشنا تھے۔۔ یہ نام تھا ترقّی پسندی۔

معلوم ہُوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوشگوار ہُوا چلی کہ بچّہ بچّہ ترقّی پسند بن گیا۔ شاعری ترقّی پسند ہو گئی۔ ادب ترقّی پسند بنا۔ سارا ملک ترقّی پسندی کے گُن گا رہا تھا۔ یہ غلام بہت خوش ہُوا۔ ترقّی کون نہیں چاہتا۔ بہت سے احباب جو ملازم تھے ترقّی کے لئے مدّتوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحائف بھی دے چکے تھے۔

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقّی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطور ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر کیا جاتا کہ فلاں ترقّی پسند ہے یا نہیں۔

اِدھر ترقّی پسند ادب کا ریکٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک کہ پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حدبندی مقرر کر دی اور ترقّی پسند رسالوں اور اخباروں میں صرف ترقّی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا اور اسے بے حد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے۔ ساری غزلیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سُن کر پیشین گوئی کر سکتا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہو گا۔ ادھر لوگ بڑی سرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن بے کار گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا اب اس نئی دنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دُھن سے ساز ملا کر اسی لَے میں الاپنا شروع کر دیا۔ میری چیزوں پر ترقّی پسند حلقوں میں تو واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو متضاد کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر رہتے ہیں۔ میں کچھ حیران ہُوا اور ایک بہت بڑے ترقّی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لیے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے۔

اس نے بتایا کہ یہ بے حد ضروری ہے۔

میں نے کہا ”لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت تُو تُو میں میں ہوتی رہتی ہے جو مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانبدار ہو کر نہیں لکھ سکتا؟“

وہ بولا ”اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔“

چنانچہ یہ حقیر مجبور نقّاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا ویسے ترقّی پسندی کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا اور جو اشخاص لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں انہیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل سب کے لئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقّی پسندی کا لیبل لگانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف ان مسائل پر قلم اٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا، نہ مصنّف کے پیغام کو، نہ پیغام کی افادیت کو، ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع، وہی مقررہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا۔ اگر یہ مل جاتے تو ترقّی پسندی کا ٹھپّہ لگا دیتا ورنہ مصنّف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ دار، تنزّل پسند اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

”آپ نے فرمایا تھا کہ نقّاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے۔“ خورد نے بات کاٹی۔

"ہاں تو بات دراصل یہ تھی کہ اس عفی عنہ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں۔ ان میں سے دو ایک کو تو میں یونیورسٹی سے جانتا تھا اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن انہوں نے میرا اتنا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ لکھتی وِکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقع بھی میسّر تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کر دیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا لیکن تعجّب ہُوا کہ یہ مدح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شُبہ ہوا۔ اِدھر اُدھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انہیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی نقّادوں کی تعداد دِن بدن بڑھتی جارہی ہے۔"

"ان کیمپوں کا کیا بنا؟"

"بتاتا ہوں، سُن یوں تو ہر تحریک کچھ عرصے کے لئے مقبول ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی ہوتی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقّی ہو گی، حالات سُدھر جائیں گے۔ انسان ترقّی کرے گا۔ دنیا بہتر بن جائے گی۔ لیکن آہستہ

آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جرنلزم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی، اگلے ہفتے اُس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ اور اگلے مہینے ایک پوری کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس تحریک کا پیرہن کاغذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا، تعمیر مفقود تھی۔ یہ ہیرو نہیں تھے۔ پبلک اب تک غلط گھوڑوں پر Betting کرتی رہی تھی۔ ان ترقّی پسندوں کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریۂ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مالیخولیا ہو جائے۔ ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے، نہ ہو گا۔ چنانچہ لوگ اس وقتی ہنگامے سے تنگ آ گئے۔ اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ انہوں نے فلمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے۔ فلمی رسالے تو فراری ادب میں بھی شامل نہیں کئے جاسکتے۔ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے جو ہاتھوں ہاتھ بکِے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں۔"

"جی نہیں، بور تو نہیں ہو رہا" خورد جمائی لے کر بولا۔ "فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا۔ طے ہوا کہ ہمارے ضلعے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں۔ لیکن داروغۂ جیل اتّفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں

فراری ادب پر خرید لایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔"

"خیر، تو یہ کمترین بدستور ترقّی پسند رہا۔ محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے۔ اس بُتِ طنّاز کو میں نے مینا بازار میں دیکھا۔ میں اپنے دو سپینئل کُتّے لیے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا مینا بازار کا نظارہ کر لوں۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینہ پُر تمکین کو قریب پا کر کتّوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینہ مذکور سے کتّے طلب کیے۔ اس نے کمال بھولپن سے کہا "ایک کتّا تو بلّی کے پیچھے بھاگ گیا۔"

انگشت بدنداں سخت پریشان ہوا اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا۔

"یوں بھاگ گیا۔۔۔" اس نے دوسرا کتّا دوسری بلّی کے پیچھے چھوڑتے ہوئے کہا۔

کتّے تو دونوں مل گئے لیکن ادا یہ اُس کی اِس درجہ بھائی کہ بجز عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شماری شروع کر دی۔ اس علاقے میں جتنے اختر حسن، اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر وغیرہ تھے سب گن ڈالے مگر افاقہ نہ ہوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی۔ وہ خالہ جائی بلائیں لے کر بولی "میں آج ہی اسے کلب میں بلاؤں گی۔" چنانچہ شام کو وہ ماہ جبیں کلب میں آئی، اس ٹھُسّے سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور بیش بہا عجب بہار دکھاتا تھا۔ گلے میں جُگنی، چمپا کلی، موتیوں کی مالا، دھگدھگی، کانوں میں پتّے بالیاں، ہاتھوں میں حسین بَند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سونے کے چھڑے، ہیرے کی نتھ، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں، سر پر چھپکا۔ اس فقیر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اُڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑے زور سے ہشت کر کے چُپ کرا دیا اور اس سے گویا ہوئی۔ کہ "کلب میں بُلانے کا تو فقط بہانہ تھا۔ اصل میں تمہیں ایک پیغام سُنانا تھا۔ میرا کزن جوانِ زیبا خرام خوبرو گلگوں دیکھتے ہی آپ پر شیفتہ و دوالہ ہُوا، عشق کا بول بالا ہُوا۔ وہ ہزار جان سے تمہارے گلِ رخسار کا عندلیبِ شیدا ہے، آہِ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب و غریب نوجوان ہے۔ عجب آن بان ہے۔ لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے۔ حُسن و خوبی

میں اپنا آپ جواب ہے۔ تم دونوں کی خوب نبھے گی۔ گہری چھننے گی۔ وہ بھی کم سِن، تم بھی جوان، وہ بھی نازک بدن، تم بھی دھان پان، وہ محوِ جادو آفرینی، تم سروِ چمن زار نازنینی۔۔۔"

"افوّہ! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی۔ حسینہ نے بات کاٹی۔ والدین میری شادی کا تہیّہ کر چکے ہیں تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے۔ کئی اخباروں میں اشتہارات بھی دیئے گئے ہیں۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے۔"

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقّی پسند معلوم ہوئی۔ گی تو اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رمبا ناچنا چاہا، زیوروں سے ایسی عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا۔ پھر سامبا ناچنے کی کوشش کی مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ رقص کی حسرت حسرت ہی رہی۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہُوا اشتہار دکھایا۔ جو ضرورتِ رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا۔ مگر ترقّی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا۔

اِشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے شہزادی ولیمہ جہاں کے سوئمبر کا ٹورنمنٹ شروع ہو گا اور مناسب اور معقول امیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہو گی۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اُترتے ہوں:-

1۔ کنوارپنے کا سرٹیفکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں اور اُمّیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائیداد کی تفصیل درج ہو۔

2۔ تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔

3۔ دو معزّز آدمیوں کے نام اور پتے جو اُمّیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔

4۔ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔

5۔ طلسماتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور سیاستدانوں کی سفارشیں ممنوع ہیں۔

6۔ اُمّیدوار ایک ہفتے کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔

7۔ مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔

8۔ کامیاب امیدوار کو شہزادی ولیمہ کے علاوہ جائیداد کا تہائی حصّہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ: سب کو خبر دار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا امیدوار ایسی سزا کا مستحق ہو گا جو پچاس روپے جرمانہ یا تین ماہ کی قید یا دونوں ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقّی پسند سپرٹ پر اظہارِ مسرّت کیا اور دُعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اس طرح ہوا کرے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگوایا۔ سیڑھی لگا کر سوار ہوا اور سوئے ٹورنامنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لیے گئے۔ آئی-کیو بھی ٹیسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے انہیں نکال دیا گیا۔ اتّفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا۔ اسے یہ سزا دی گئی کہ فہرست سے خارج کرتے وقت اس کے مُنہ پر سفیدی مل کر سارے شہر میں پھرایا گیا تا کہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائیداد کا کون سا حصّہ ملے گا، شمالی یا جنوبی۔ جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا۔

خاکسار سیمی فائنل جیت کر فائنل تک جا پہنچا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آمرا۔ یہ مَردود کہ بیحد نحیف و نزار تھا۔ ایک بہت بڑی جائیداد کا تنہا وارث تھا (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جا رہی تھی)۔ اس مَردود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مفلس تھا۔ مفلس عاشق کہلاتے ویسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ ہے کہ

مفلسی سب بہار کھوتی ہے

آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کم بخت کے آجانے سے ٹورنمنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے جاتے۔ اُدھر شہزادی کی امّاں نے برادرزادے کے لیے رورو کر بُرا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنامنٹ کے نتیجے کی خبر وحشت ناک سُنتے ہی موم جامۂ صبر چاک ہوا۔ ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پر جوتا نہ پاوں میں پگڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافِ توقع مبارکباد دی اور کہا کہ لڑکی کو اس کی والدہ نے بے حد بگاڑ رکھا ہے۔ شاید تونے بیگم کو نہیں دیکھا جو دراصل۔۔۔بے غم۔۔۔۔

ہے۔لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم و شحیم بن جائے گی۔اگرچہ مجھے مٹاپا مرغوب نہیں لیکن وائے نادانی کیا بتاؤں کہ ع میں اسیر دام فربہی رہا ہوں۔۔۔۔اے نوجوان تو گھاٹے میں نہیں رہا۔(اس کے بعد ترنّم سے بولے)

تم بھی بیاہ کرو تو جانو

ہم دُکھیوں کی فریاد وں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کو تسلّی تو نہ ہوئی لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادیاں اس ملک کی ہرگز ترقّی پسند نہیں ہیں۔

"یا پیرو مُرشد ایک بات پوچھوں؟"خورد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دو پوچھ۔۔۔"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتایئے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مُچ محبّت بھی ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ الضلع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے۔ہائیکورٹ کے پاس جو باغیچہ ہے وہاں اکثر جایا کرتے۔ وہیں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رخِ روشن پر عموماً

ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی پیشانی پر ہوتا کبھی رخسار پر، تو کبھی ٹھوڑی پر۔ اور کسی روز سِرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا۔

مصحفِ رُخ پر تیرے خال نگہبان ہُوا

یہ غلام حبشی حافظِ قرآن ہُوا

تِس پر اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا اور سُرمے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا۔ میں نے جھٹ سُرخ ہونٹوں کی تعریف کی۔

لال ہیں آپ ہی لب سُرخی پاں دُور رہے

نازکی کہتی ہے یہ بارِ گراں دُور رہے

اس پر شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ پان والی سُرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لِپ سٹک ہے۔ اگرچہ اس فقیر کو علم تھا کہ لِپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سٹک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا اور پامسٹری کا ذکر چھیڑا۔ وہ بولی کہ میں جانتی ہوں آپ حیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا: ”کیا میں انہیں چھُو سکتا ہوں؟“

وہ بولی: ”آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہیں۔“

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ کیا ترقّی پسند محبوبہ تھی۔ بے حد مسرّت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقررہ ہے تو فرار بُزدلی میں شامل ہے۔

بیاہ کا ایک دن معیّن ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آئی

چنانچہ میں نے اُسے شادی کے لیے کہہ دیا۔

بولی: "آپ خرّاٹے تو نہیں لیتے ؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جایئے اور میرے والدین کو منا لیجئے۔"

یہ جواب بھی ترقّی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ پھر جملہ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا گویا تہمت لگا رہے ہوں۔ پھر بولے: "اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لیے کیا انتظام ہو گا؟ کوئی ذاتی

ملکیت یا بیمے کی پالیسی ہے؟" پھر مہر کا قضیہ شروع ہُوا، جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور انشاء اللہ مہر کی ادائیگی تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ آخر آپ اتنے لمبے چوڑے مہر کے لیے کیوں مُصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر مہر تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائے گی۔ خیر یہ حقیر مان گیا۔

وہ چاہتے تھے کہ پُرانی رسومات ساری ادا کی جائیں۔ میں معروض ہُوا کہ ہجوم اکٹھا کر کے غُل مچانا ایّامِ جاہلیت کی رسم ہے۔ جب پبلسٹی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بُلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں تصویر آ جاتی ہے۔ اور پھر شور و غل سے یہ احقر بہت گھبراتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مُچ کچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مُصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصّوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں، پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خوب ڈھول بجائیں اور دعوتوں پر سارے ایشیا (معہ اشیائے کوچک کے) مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو دوبارہ بغور تو دیکھو۔ دیکھا تو واقعی حلیہ بدل چکا تھا۔ بھنویں اکھیڑنا، بال ترشوانا، ناخن پالنا۔۔۔ ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور میک اپ سے کسی روز بے حد لمبی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصلی شکل دیکھنا محال تھا۔ چنانچہ عشق و عاشقی کو بالائے انگیٹھی رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزّل پسند ایک ترقّی پسند کو سرِ بازار پھُول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھّر اُٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بِلبِلا اُٹھا اور بولا "اے مردِ سُخن فہم یہ سب تو بے سمجھ ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تُو تو ترقّی پسند ہے۔ تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔"

اِس واقعے کے بعد اُلجھن سی پیدا ہو گئی۔ کیسے ترقّی پسند اور کہاں کی ترقّی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رُخ میں بھی ترقّی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقّی پسندی کے تعلّقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک

دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے اس طبقے سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہُوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پگڑیاں اُچھالنے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ اِدھر فلمی پرچوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہ فقیر فلمی نقّاد بن گیا اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ فلمساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اِسی بہانے دوستی ہو گئی۔ ترقّی پسند اور رجعت پسند دونوں مجھ پر رشک کرنے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر خاک ہُوا۔ دھول ہوا۔" کلاں نے جھلّا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا بے صبر ہے۔ اچھا لے، یہ سفر یہیں ختم ہُوا۔ یونہی طبیعت بدمزہ کر دی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تو آئیو۔"

سرِ شام جہاز باد خورد آن دھمکا اور بولا۔

"صبح جو کچھ ہُوا اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سُننے کو تیار ہوں۔"

جہاز باد کلاں مُسکرا کر بولا: "ہم معاف کرتے ہیں اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سُناتے ہیں۔"

جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

؎ فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب

بس ہو چکی نماز مُصلّا اٹھایئے

"اے رفیقِ دیرینہ ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کتّے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اُٹھائی۔ کتّا دُور جا چکا تھا لہٰذا ورق گردانی کرنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جو اُٹھا تو اپنے آپ کو پرولتاری پایا۔ سوچا کہ شاید مشیت ایزدی اسی میں ہے کہ پرولتاری ہُوں اور نام پاؤں۔۔۔"

"اے ہمدمِ طوطی گفتار، لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے اُردو میں۔ ڈکشنری دیکھ، بہت کچھ معلوم ہو گا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں۔ بڑی ہمّت چاہیے۔ دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکچروں میں جانا پڑتا ہے۔ پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد فدوی نے یہ کورس مکمّل کر لیا۔ ساتھ ہی زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اُٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طویل بحثیں ہوا کرتیں۔ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب، جنس اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سُن کر عوام چونک چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضیعِ اوقات سمجھتے۔ انسانی رویّے کے عالمگیر قوانین ہمارے لیے لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم نہ صرف شُبہ کی نظر سے دیکھتے بلکہ مِنٹوں میں دھجّیاں اُڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی۔۔۔! کیا رُعب تھا، کیا دبدبہ تھا ۔۔۔ سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ دیتے، جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے۔ چند ہی فقروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"بھاگ چلو یارو پرولتاری آ گئے۔ "کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور جوتیاں تک چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی پبلک کو آگے لگا رکھا تھا وہاں مقامی لڑکیاں تھیں کہ سیدھے مُنہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب، دوستی، ایمان ،فلسفہ، عشق۔۔۔کے پرخچے ضرور اڑاتے تھے لیکن یہ سب دِکھاوے کے لیے تھا۔ کبھی کبھی ہمارے دل بھی محبّت کی آگ سے سلگنے لگتے۔ ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے۔ مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے۔ رہ گئی جنس، سوال کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا جتنا کہ غیر پرولتاریوں کا۔ لیکن ہماری معلومات کا ماخذ فرائیڈ ڈی ایچ لارنس اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنّفین کا حوالہ بھی نہیں دیا اور ہاں میں بتانا بھول گیا کہ پرولتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے۔"

"کیسا انقلاب؟"

"کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب۔۔۔ بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے ہیں۔ بس انقلاب ہو، کہیں، کسی قسم کا، کسی سائز کا۔۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لیے اُکساتے، ہم چاہتے تھے کہ

ہنگامے بپا ہوں اور افراتفری مچے، دنگے فساد ہوں تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واقع ہو جائے۔ لیکن مجھے غصّہ تھا تو اس پر کہ یہی لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھیں، کلب میں وہ دھاچوکڑی مچاتیں کہ خُدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے تو خوب چہلیں کرتیں۔۔۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے۔ ویسے اچھے بھلے تھے، لیکن اپنے آپ کو بے حد غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے۔ اس کی وجہ اپنی بے جوڑ شادی بتاتے حالانکہ ہر ایک ماشاءاللہ چھ چھ بچّوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیٰحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے فلرٹ کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں اس لیے یہ بورژوا تھے۔"

"اس ناچیز کے چچا جان جو تھانیدار ہیں کار رکھتے ہیں۔ کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟" خورد نے پوچھا۔

"ضرور ہوں گے۔۔۔ تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے لئے پھرتے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پینتالیس پچاس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟"

"غالباً انہیں سنہ تیس اکتیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے اور نئے سٹریم لائینڈ ماڈل در حقیقت دیدہ زیب ہوتے ہیں" خورد نے مؤدبانہ عرض کیا۔

"مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اُڑاتے۔ ملتے ہی سوال ہوتا ہے کہ آپ کی ننھی بچّی کا کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اُترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے ہمیں ضرور بلایئے، مگر یہ بورژوا تھے کہ"

"ویسے بورژوا ہوتا کیا ہے؟"

"بورژوا وہ ہے۔(کلاں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جُنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو۔۔۔ جو۔۔۔ بالکل بورژوا ہو۔۔۔ سُنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا اُسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔"

"یا پیر و مرشد ایوننگ اِن پیرس کی نیلی شیشی پر ایک لفظ بورژوا لکھا ہوتا ہے۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کئے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب برائیاں کیں اور اُنہیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بینک میں ان کا حساب صفر ہے

بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کے لیے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر غصّہ آتا ہے۔ وہ بولیں جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اُکتا چکا تھا لیکن یہ گلے کا ڈھول تھا کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا۔ دہنے بائیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا شروع کیا اور ہرجائی کے نام سے شہرت پائی۔"

"آہا تو آپ ہرجائی بھی رہ چکے ہیں۔ ملایئے ہاتھ۔ یہ ناشُدنی بھی ہرجائی رہ چکا ہے۔ آہ! سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں۔"

"لیکن دو تین لڑکیاں تو سچ مُچ پسند آ گئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا۔"

"ان سب سے؟" خورد چونک پڑا۔

"نہیں ایک سے، لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہونے والی ساس کِس مزاج کی ہے۔ کُنبے میں بہت زیادہ لوگ تو

نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ مُرید بننے کے کیا امکانات ہیں۔ شکّی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں البتّہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے اور وہ ہے خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرّت سے انسان تب تک آشنا نہیں ہوتا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکتی ہے۔"

"یار تُو بات مت کاٹ۔ چپ چاپ سُنتا رہ۔ یہ لڑکیاں بے حد MATERIALISTIC تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا میں ہر چیز سے بیزار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دُعا مانگتا کہ ۔۔۔اے پروردگار میرے حال پر رحم فرما۔ رشیدہ کی کہیں شادی کر دے۔ نرگس بن غفور کی کہیں منگنی ہو جائے۔ مس ریٹا معراج الدّین اور ڈورتھی کا بھی کہیں انتظام کرا دے۔"

"لیکن اس کا بورژوا ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کاش کہ موضوع بدل جائے۔"
خورد جو اتنی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔۔۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ تجھے یاد ہو گا کہ الف لیلٰہ کے سندباد کی ملاقات تسمۂ پیر سے ہوئی تھی جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی مسخرے سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندر گاہ پر اُترا جہاں بندر ہی بندر رہتے تھے۔ وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہو گا۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ فقط تین چار گھنٹے مجھے چھوڑ تا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دُور رہنے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ منّت سماجت کی، ڈرایا دھمکایا۔ آخر تنگ آکر خُودکُشی کی دھمکی دی۔ تِس پر وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خُودکُشی کروں گا اور پالیسی دینے کے لیے اگلے جہاں تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ جب میں نے سچ مُچ پستول کھایا تو بولا۔ اے مردِ نیک خصلت اگر تو واقعی خُودکُشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا۔ مجھے اتنا غصّہ آیا کہ خُودکُشی کا ارادہ ترک کر دیا اور سیدھا کباڑی بازار میں الف لیلہ کا نسخہ مطالعہ کرنے گیا تا کہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اُس مردِ نابکار کو انگوروں کی شراب پِلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہٰذا میں نے بادۂ افرنگی پلایا۔ لیکن اثر اُلٹا ہُوا۔ پی کر وہ اپنے تئیں ہوش میں نہ رہا۔

کچھ دیر واہی تباہی بکتا رہا۔ پھر اس حقیر کو خوب زد و کوب کیا۔ بے حد حیران ہُوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیر دامِ بلا ہُوا۔ خود گرفتار بحرِ ستم ہُوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرما کر اس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے بعد جب کہیں ملتا خجل ہو کر رہ جاتا۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی لیکن الف لیلہٰ سے عقیدہ اُٹھ گیا۔"

"گستاخی معاف۔" خورد بولا "شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے سُنائے ہیں، بالکل الل ٹپ ہیں۔ غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے تُکا رہا۔"

"مگر تو نے مجھے بار بار ٹوکا بھی تو ہے۔ شاید ایک دن میں دو سفر سُن کر تُو اکتا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سُناؤں گا جب تک تو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کر لے۔"

"کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟؟"

"نہیں اپنے۔"

اور وہ دونوں خنداں ہوئے۔ فرحاں ہو کر شک و شبہات دُور ہوئے۔ دل صاف ہوئے اور جہاز باد کلاں کا چوتھا سفر تمام ہوا۔

اگلے روز جب شاہبازِ نجوم نے آفتاب پر جال پھینک کر شکار کیا۔ سپاہِ انوار کو شکست ہوئی۔ ظلمت کی حکمرانی ہوئی تب جہاز باد خورد حاضر ہو کر بولا ''اُستاد کلاں اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کروں گا۔ اپنی گھڑی بھی کسی کو دے آیا ہوں اور دو بوتلیں ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ۔"

جہاز باد کلاں نے یوں کلام کیا۔۔۔

جہاز باد سندھی کا پانچواں سفر

؎ دل دُکھایا کسی گُلچیں نے کوئی گُل توڑا

باغ سے نالۂ بلبل کی صدا آتی ہے؟

اس پر خورد پھر بولا ''بھائی ایک صلاح ہم دیں گے۔ وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے ان کا قصّے سے کوئی سروکار نہ تھا۔"

"اے نوجوان بلند بخت! اعتراض کرنا میری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایاتِ قدیم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے پڑھے۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان گوئی اشعار کے بغیر نامکمّل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ۔ رواداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے۔"

"رواداری نہیں۔۔۔ وفاداری بشرطِ استواری۔" خورد نے لقمہ دیا۔

"اچھا بابا وفاداری سہی۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا۔۔۔ اگر تیرا کوئی پیر ہے تو تُو خاموش رہ۔ آج کا سفر بالکل مختصر ہے اور غالباً آخری سفر ہو گا۔ لہٰذا آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ۔

سُن میں زیادہ دیر بورژوا نہ رہ سکا۔ لوگ اس لفظ کے نہ ہجے کر سکتے تھے نہ صحیح تلفّظ کسی کو آتا تھا۔ بار بار معنے پوچھتے۔ اِدھر میری کار بھی بِک چکی تھی۔ سوچا کہ ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کیے تھے۔ ورنہ کافی ہاؤس بُرا نہ تھا۔ چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی۔ موسمِ گرما گزارنے کے لیے سانگلہ ہل کا رُخ کیا کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہاں نہ جانے کیا ہُوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعتہً بدل گئے۔ غالباً یہ اونچے طبقے کی صحت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نِکلا۔ آخر کار اس

جگہ پہنچ گیا جہاں تُو مجھے آج دیکھ رہا ہے۔ اب میں بالکل بے نیاز ہوں۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ مطلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔ کسی کو خط نہیں لکھتا۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو۔ بِلا غرض کسی کو مدعو نہیں کرتا۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں۔ بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کیسے ختم ہوئے ہیں جو میں اور تو انہیں ختم کر سکیں گے۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اُٹھ چکا ہے۔ پڑھنا لکھنا ملنا جلنا یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ شہزادیوں کی متواتر بے وفائی سے شادی میں بھی دلچسپی نہیں رہی۔ بچّوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے۔ دو تین سال کھیلو، پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی استقامت میں بڑی مدد دی ہے۔ آ تجھے بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں۔"

"افّوہ! چچ۔۔۔ چچ۔۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔۔۔" خورد نے اظہارِ افسوس کیا۔

"اب میں NIHILIST ہوں۔" نی ہلسٹ! کلاں نے اپنے سینے پر مکّوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو اس لفظ کے معنی پوچھے ہوں تو۔۔۔ اور اے مرد جلد باز میرے پانچویں سفر تمام ہوئے۔ آفیشلی مجھے سات سفر کرنے

چاہئیں تھے لیکن دنیا کے حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ذہنی تگ و دو میں اپنی منزل میں نے پالی ہے۔ میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے۔ اور تو جو یوں بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو بقیہ دو سفر تو کر آ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں۔۔۔ ایسے ماحول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے؟"

"یہ محل میرا کہاں ہے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں خاکسار نے اخباروں رسالوں میں بڑے دردناک بیانات چھپوائے کہ میں ایک اُردُو اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک نے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ بھیجا۔ دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے، فوراً سمجھ جاتی ہے (سرگوشیوں میں) اے رفیقِ تنہائی یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا اور برخوردار تیری پوسٹ وار پلین کیا ہے؟ نوکری کے لیے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا، لیکن جس محلّے میں رہتا ہوں وہاں چوہے بلّیاں اور کتّے بہت زیادہ ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں۔"

"اس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تُو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام تجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا موڈ یکلخت ادبی و علمی ہو گیا ہے۔"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے۔"

"یہ گنجِ بے بہا تو نے کیونکر پایا؟"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی۔"

"اخّاہ! پھر تو یورینیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی ہیئت کذائی ٹھیک کر۔ حجامت کرا، عینک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دھلوا کر استری کروایا کر۔"

"کہیں مجھے انٹلکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں۔"

"تو کیا ہوا؟ خیال ہے کہ چند شرفاء ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لیے ایک بلند پائے کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ ویسے کام دوسرے لوگ کریں گے لیکن نام ہمارا ہو گا۔ کیا ارادہ ہے؟"

"خاکسار آمادہ ہے؟"

"اب جبکہ تو نے سب کچھ سُن لیا ہے بتاؤ کہ تُو بھی کبھی ایسی کٹھن منزلوں سے گزرا؟ کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں؟"

خورد نے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا "آپ واقعی بڑے مصائب سے دوچار ہوئے۔ صیدِ انتشار ہوئے۔ اب آپ حظ اُٹھائیں۔ دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خُدا کرے تمام عمر شاد رہو، فائز بمر ام و بامراد رہو۔"

اس پر جہاز سندھی کلاں نے خورد کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اس کا رُتبہ اور بھی بڑھایا۔ جب تک زندہ رہے دو جان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالقِ زمین و زمان، آفرینندۂ ہر دو جہان، کارسازِ مطلق، قادر بر حق کا ہر حال میں شُکر ادا کرنا چاہیے کہ بندوں کو کیسی کیسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ گاڑھے وقت میں اُسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

نتیجہ۔۔ پس اے پیارے بچّو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

دو نظمیں

کون

کون ہے میری جوان سال امنگوں کا سہار مرے ہمدم میرے دوست!

تجھ کو معلوم اگر ہے تو بتا

کس کے شب رنگ معطّر گیسو

میرے بازو پر بکھر جاتے ہیں؟

کسی کے خوابیدہ شبستانوں میں

کیف آمیز اندھیرے لے کر

نیند کی دیوی تکلّف کے بغیر

میری پلکوں میری آنکھوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہے

موزے جب گردشِ رفتار سے گھِس جاتے ہیں

سوزنِ سادہ سے کون اُن کو رفُو کرتا ہے؟

میری بکھری ہوئی بوسیدہ کتابیں آخر

کون چُن دیتا ہے ترتیب سے الماری میں

سلوٹیں دیکھ کے ملبُوس پر خم کھائی ہوئی

اِستری کون کیا کرتا ہے؟

آنکھ کس کی مِرے بٹوے پر جمی رہتی ہے

کون ہر ماہ چکا دیتا ہے دھوبی کا حساب؟

جب کبھی زندگی درماندہ وواماندہ نظر آتی ہے

اور بن جاتی ہے اک خُوں بھرا جام

تلخیاں رُوح میں رچ جاتی ہیں

تہ بہ تہ ظلمتیں جم جاتی ہیں

زیست اور موت میں رہتا نہیں ننھا سا تفاوت باقی

ایسے لمحوں میں سدا

کون دیرینہ رفیق آ کے پکڑتا ہے مجھے بازو سے

اور لاتا ہے سوئے بزم، جہاں میرا لہو کھول کے تپ جاتا ہے

تُو بتا سکتا ہے کیا؟

ہاں ذرا میں بھی سُنوں

کیا کہا۔۔۔؟

تیرے گستاخ تبسّم پہ ہنسی آتی ہے

تیرا وجدان ابھی تک ہے بہت خام اے دوست!

کیا بتاؤں میں تجھے

وہ کوئی اور نہیں

وہ تو میں خود ہوں۔ میری جاں، مرے ہمدم، میرے دوست!

خراٹے

اُس نے خراٹے سُنے۔۔۔

دفعتاً چونک پڑا، جاگ اُٹھا

لبِ نازک پہ مچلتے تھے "رسیلے نغمے"

اور بیوی تھی کہ خوابیدہ تھی

فربہی تھی کہ جوانی کا سہارا لے کر

تہہ بہ تہہ جسم پہ اس طرح جمی جاتی تھی

جس طرح کیک کرسمس کا ہو

اس نے خرّاٹے سُنے۔۔۔۔

مٹھیاں بھینچ کے یوں کہنے لگا

آج نیند آئی تھی دو روز کے بعد

کہ حسیں ہونٹوں کے "نغموں" نے سکوں چھین لیا

اور اب زندگی بھر دل کو نہ آئے گا قرار

کہ یہ "نغمے" کسی اندوہِ مسلسل کا پتہ دیتے ہیں

ایسے جینے پہ خُدا کی پھٹکار!

اُس نے خرّاٹے سُنے

(اپنی بیوی کی لگاتار علالت کا خیال

یہ عیادت کا مسلسل بحران

کہ کسی پل بھی سکوں مل نہ سکا

اور پھر اس پہ ستم ویدوں طبیبوں کا نزول

حُسنِ بیمار ۔۔۔ مگر ویسا ہی بیمار رہا

جیسے صدیوں کا سماج)

اُس نے خرّاٹے سُنے

اُٹھا آئینے میں صورت دیکھی

آنکھ کے گرد سیاہ حلقوں کو رقصاں پایا

سبزۂ خط تھا ہم آغوشِ ذقن

اپنی صورت سے ڈرا

اور کیا جانیے کیا سر میں سمائی وحشت

دل میں اک عزمِ جواں جاگ اُٹھا

اُس نے خرّاٹے سُنے

اور کچھ سوچ کے الماری کی جانب لپکا

اُسترا کانپتے ہاتھوں میں لیا۔۔۔ کھولا۔۔۔ پرکھ کر دیکھا

دھار تھی تیز کسی تیغِ مجاہد کی طرح

دیکھ کر بیوی کے مرمرسے گلو کی جانب

اس نے آئینے میں خود پر بھی نظر دوڑائی

اور سوچا کہ یہی موقعہ ہے۔

اُس نے خرّاٹے سُنے

کمرے سے جھانک کر باہر دیکھا

اک ہمہ گیر خموشی تھی فضا پر طاری

دُور اک کتّا پڑا سوتا تھا

اس نے سوچا کہ یہی موقعہ ہے

اُسترا زور سے پکڑا، کانپا

اور پھر شیو بنانے لگا جلدی جلدی

ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد

خالد نے ولایت سے آکر مقصود گھوڑے کو ہوم سِک کر دیا۔۔۔

خالد کے آنے پر کرکٹ کا میچ ہُوا۔ جس میں ایک طرف خواتین تھیں اور دوسری طرف حضرات۔ حضرات کو برقعے پہننے پڑے۔ ماڈرن قسم کے مصری ترکی یا اصلی بغدادی برقعے نہیں بلکہ پرانی وضع کے شٹل کاک نما برقعے جنہیں پہن کر باہر والوں کو اندرون برقع کی خبر نہ ہو اور اندر سے مقامی حالات کا کچھ پتا نہ چلے۔ باؤلنگ کرتے وقت بھی برقعوں کے ہُڈ بند رہتے اور گیند کے پیچھے بھاگتے وقت بھی۔ لوگوں کو شاید پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ برقعے پہننا کیا معنی رکھتا ہے۔ حضرات نے الجھ کر خوب نٹوں کے تماشے دکھائے۔

میں سکور گِن رہا تھا اور شیطان بیٹھے نِٹنگ کر رہے تھے۔ وہ اس قسم کی تقریبوں پر ہمیشہ نِٹنگ کیا کرتے ہیں، اپنی محبوبہ کے لیے۔ کبھی سوئیٹر بُن رہے ہیں، کبھی جرابیں۔

آشوب چشتی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ جنرل گارڈن پر تنقید کر رہے تھے۔ حبشیوں پر بحث ہو رہی تھی۔ میں حبشیوں کا طرفدار تھا کیونکہ وہ افریقہ میں رہتے ہیں۔

اس روز بالکل معمولی سی صبح طلوع ہوئی۔ روزمرّہ کی طرح جمائیاں لیتا سورج نِکلا۔ پرندے بھی انہی پُرانی سُروں میں چہچہائے۔ ریڈیو پر حسبِ معمول سارنگی پر بھیرویں سنائی گئی۔ کسے پتہ تھا کہ یہ معمولی صبح ایک اہم دن میں تبدیل ہُوا چاہتی ہے۔

خالد دو سال کے بعد لوٹے تھے۔ اب وہ پرانے خالد نہیں تھے جو ہر وقت لائف کا رونا رویا کرتے کہ "فلاں کی لائف بن گئی، فلاں نے فلاں کی لائف تباہ کر دی۔" اب وہ مجسّم آئن سٹائن کی تھیوری تھے۔

خالد کا شیطان سے تعارف کرایا گیا۔ خالد خاص غیر ملکی لہجے میں بولے۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"پہلے آپ اپنے لیے کچھ کیجئے۔" شیطان نے صابن کی جھاگ کی طرف اشارہ کیا جو خالد کے چہرے پر لگا ہوا تھا۔

دونوں دُور دُور جا بیٹھے۔

"بیٹی، اب آ بھی جائیے۔ اتنی دیر کر دی۔" چشمی صاحب کار کی طرف دیکھ کر چلّائے۔

"اتنی دیر سے کہہ تو رہی ہوں کہ بس ایک منٹ میں آئی۔" ہم سب مُڑ کر دیکھنے لگے۔ دروازہ کھُلا اور کوئی چیز بلّا ہاتھ میں لیے نکلی جو چند لمحوں کے لیے لڑکی سی معلوم ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ چشمی صاحب کی دخترِ نیک اختر ہیں۔ ان کا نام انجم ہے اور محبوبۂ شیطان ہیں۔ شیطان کی زندگی میں پہلے دو انجم آچکی تھیں جنہیں تمیز کرنے کے لیے انجم خورد اور انجم کلاں کہا جاتا تھا۔

"اور یہ تیسری انجم؟"

"یہ انجم خورد بُرد ہے۔" وُہ بولے۔

میں نے انہیں بتایا کہ اب تو شاید ہی آس پاس کے علاقے میں کوئی انجم باقی رہی ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ اگر اس قسم کا اشتہار دے دیا جائے۔

"کیا آپ انجم ہیں؟

اگر ہیں تو مزید وقت ضائع مت کیجیے۔ فوراً مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کیجئے جو صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔"

چشمی صاحب کے عزیزوں سے تعارف ہوا۔

"یہ کلیم الدّین عرف کالو ہیں۔"

"آداب عرض!"

"اور یہ بہاؤ الدّین عرف بھُورو ہیں۔"

"آداب عرض!"

"اور آپ کی تعریف۔۔۔؟" ایک صاحب نے شیطان کے متعلق پوچھا جو کالو اور بھُورو صاحب کے ساتھ کھڑے تھے۔

"مجھے ڈبّو سمجھ لیجئے۔۔"

چار بالکل ایک قسم کے حضرات سے مل کر شیطان نے کہا "مجھے آپ چاروں سے مل کر بہت خوشیاں ہوئیں۔"

میں نے انجم کے متعلق پوچھا اور عاشق ہونے کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ وہ بولے "میں انجم پر ہرگز عاشق نہ ہوتا اگر وہ رضیہ سے اس درجہ مشابہت نہ رکھتی۔" میں نے انہیں بتایا کہ رضیہ اور انجم میں صرف اس قدر مشابہت ہے کہ دونوں کی دو دو آنکھیں ہیں، ایک ایک ناک اور دو دو کان ہیں۔ بس!

اب مردوں کی باری تھی۔ خواتین فیلڈ کرنے نکلیں۔ تالیوں کے شور میں دو حضرات برقعے پہن کر نکلے۔ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ بھٹک گئے۔ ایک کا رُخ شمال مشرق کی طرف ہو گیا اور دوسرے کا شمال مغرب کی طرف۔ خواتین نے ان کی مدد کی اور اُنگلی پکڑ کر انہیں وکٹوں کے سامنے لایا گیا۔

پہلی گیند پر ایک صاحب نے برقعے کے اندر حیرت انگیز ہٹ لگائی۔ دوسری گیند پر گیند بلّا برقع سب آپس میں اُلجھ گئے۔ تیسری پر انہوں نے زور سے بلّا اپنے گھٹنے پر دے مارا اور بجائے سامنے بھاگنے کے وکٹ کیپر کی طرف چل دیئے۔ آواز دے کر انہیں واپس بلایا گیا۔ ایک صاحب نے خواہ مخواہ اُچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ معلوم ہُوا کہ برقعے میں بھِڑ داخل ہو گئی ہے۔ برقع اُتار کر بھِڑ کو باہر نکالا۔ انجم کو گھورتے رہنے کے باوجود مقصود گھوڑا اچھّا کھیلا۔ پھر موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصود گھوڑا بھاگتا بھاگتا رُک گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر سائیکل کے چلے جانے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ وہ رن آؤٹ ہو چکا ہے۔

انجم نہ جانے کس بات پر کس سے خفا ہو رہی تھیں۔ خالد نے آگے بڑھ کر معافی مانگی۔

"معافی؟ معافی کس بات کی؟"

"پتہ نہیں۔۔۔ لیکن چونکہ میں مرد ہوں اس لیے قصور لازمی طور پر میرا ہی ہو گا۔"

انجم شرمانے لگیں۔ دراصل ان کا ہاتھ چھِل گیا تھا اور ڈاک کے ٹکٹ جتنے زنانہ رومال سے مالش کر رہی تھیں۔ شیطان بولے "اس پر تھوڑی سی سپرٹ لگالو"

پھر انجم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر بولے۔ "اس پر تھوڑی سی سپرٹ بے شک مت لگاؤ۔"

میں نے شیطان سے خالد کے متعلق رائے پوچھی۔ انہوں نے بتایا "یہ شخص اتنا چُست ہے کہ ہاتھ میں کیمرہ لے کر خود اپنی تصویر اُتار سکتا ہے۔"

"اور یہ لڑکی؟" شیطان نے بے صبری سے پوچھا۔

"اس کے سامنے ایک شاندار ماضی ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور چشمی صاحب۔۔۔ وہ بزرگ نما شخص؟" میں خالد سے پوچھا

"وہ شخص۔" خالد نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "ایسا ہے کہ اگر پنیر سے اس کا واسطہ پڑ جائے تو پنیر ہار مان لے اور دوبارہ دہی بن جائے۔"

اگلی صبح اخباروں میں چھپ گیا کہ خواتین نے حضرات کو تقریباً ڈیڑھ سو رنز سے شکست فاش دی۔

چشمی خاندان تین سو سال پُرانا تھا۔ اس کا ثبوت خاندان کے افراد کے چہروں سے بھی ملتا تھا۔ وہ کسی دوسرے مُلک سے آئے تھے اور وہاں کسی اور مُلک سے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے کہ بھلا وہ وہاں سے یہاں کیوں آئے۔ میرا خیال تھا کہ ایسے لوگ کسی مُلک میں زیادہ دیر نہیں قیام کر سکتے۔ مقامی باشندے تنگ آ جاتے ہیں۔ وہ چشمی کیوں کہلاتے تھے؟ یہ ایک راز تھا۔

خاندان کے سارے افراد کی تعداد بائیس کے لگ بھگ تھی۔ لوگوں کی رائے تھی کہ وہ درجن بھر ہی کافی ہوتے۔ خاندان کے موجودہ سرکردہ ایک بزرگ تھے اور اِن بزرگ کی سرکردہ چند جہاندیدہ خواتین تھیں۔

یوں دیکھنے میں وہ سب بڑے شرمیلے تھے، لیکن آپس میں ہر گز شرمیلے نہیں تھے۔ اس کا ثبوت ان متعدد شادیوں سے ملتا تھا جو چشمی خاندان میں ہوتی رہتیں۔ چشمی حضرات شروع شروع میں بڑے خلیق اور مہمان نواز ہوتے، لیکن بہت جلد سیکھ جاتے۔ چشمی بچّے بڑے خوبصورت ہوتے لیکن پھر بڑے ہو جاتے۔ وہ بچّے جنہیں آزادانہ تعلیم دی جاتی کہ خود صلاحیتیں پیدا کر سکیں۔

خلافِ توقع نامعقول نکلتے اور وہ بچّے جنہیں ڈرا دھمکا کر پڑھایا جاتا وہ بھی خلافِ توقع نامعقول نکلتے۔ چنانچہ سارے چشتی بچّے احمق تھے۔ بڑے چشتی اور بھی زیادہ احمق تھے کیونکہ ان کا وزن زیادہ تھا۔

ویسے چشتیوں میں کچھ اتنی زیادہ برائیاں بھی نہ تھیں، مصیبت یہ تھی کہ اُن کی خوبیاں نہایت بیہودہ تھیں۔ شیطان کی عادت ہے کہ کسی نئی جگہ پہنچتے ہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ سب سے عجیب و غریب کُنبہ چُن کر اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سوشل ہو جاتے ہیں۔

جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ انجم چشتی عرف نورِ چشتی پر عاشق ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو سارے دوست حیران ہوئے سوائے میرے۔ میں شیطان کی کسی بات پر حیران نہیں ہوتا۔

اُس خاندان میں سب سے نمایاں شخصیت آشوب صاحب کی تھی۔ یوں تو وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی باتیں تھیں۔ متواتر اَن تھک باتیں۔ مجموعی طور پر اُن کی آواز بُری نہیں تھی، بس وہ اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کے عادی تھے۔ یہ استعمال فضول خرچی کی حد تک پہنچ

چکا تھا۔ جب کبھی اُن کے ہاں فون کیا جاتا آشوب صاحب کی آواز بیک گراؤنڈ میں ضرور سنائی دیتی۔

ان کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات ہر وقت بیٹھے رہتے۔ یہ حضرات آشوب صاحب کی طرح بے کار تھے۔ ان کا گزارہ بھی مکانوں اور دکانوں کے کرائے پر تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے تھے جو کسی نہ کسی غرض سے آتے۔ قرض مانگنے، اپنی مصیبتیں سُنانے یا چشمی لڑکیوں کے رشتے کی درخواست کرنے۔

لیکن ہر ایک کو چشمی صاحب کی باتیں سُننا پڑتیں۔ چنانچہ صبح شام، دن رات، گرمی سردی ملاقاتوں اور باتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ افواہ تھی کہ اگر وہ باتیں نہ کریں تو اُنہیں مالیخولیا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ مالیخولیا کو وہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تبدیلئ گفتگو کی غرض سے پہاڑ پر گئے۔ وہاں خواتین زیادہ تھیں لٰہذا باتیں سُننے والا کوئی نہ مِل سکا۔ آشوب صاحب کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

وہ طرح طرح کی مفید باتیں سُناتے۔ مختلف شہروں کے زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم ٹمپریچر بتاتے۔ یہ بتاتے سلفانمائیڈ دوائیاں مغلوں کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھیں، بے خبری کے عالم میں۔ ایکسرے اور ریڈیم اشوک کے

وقتوں میں دریافت ہو چکا تھا لیکن با قاعدہ استعمال انگریزوں کے کہنے پر شروع ہوا ہے۔ اگر شیخ سعدی اپنی سیاحت کے دوران میں ایک چکّر نیوزی لینڈ کا لگا آتے تو جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ بلکہ جغرافیہ مختلف ہوتا۔ حقّہ حضرت نوح علیہ السّلام کے وقتوں کی چیز ہے۔ امرود میں وٹامن اے، بی سے لے کر وائی زیڈ تک ہوتے ہیں۔ ہنری ہشتم نے ہشت شادیاں کیں لیکن کامیاب ایک بھی نہ ہوئی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے خواب بھی سُناتے جو اکثر اُن کے احباب کے متعلق ہُوا کرتے۔ خوابوں میں زمین پھٹتی اور ان کا ایک دوست اندر سما جاتا۔ یا دیکھتے دیکھتے بجلی کڑکتی اور ان کے ایک دوست کے اوپر گر جاتی۔ یا ایک دیو آتا اور اُن کے کسی دوست کو اُٹھا کر دوڑ جاتا۔

جب وہ اپنے ڈراؤنے اور تباہ کُن خواب چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے حضرات کو سُناتے تو ہمدردی کا اظہار بھی کرتے جاتے اور ایسی نگاہوں سے انہیں دیکھتے جیسے اُن کی زندگی کے دن گنے گنائے رہ گئے ہیں۔ اب اللہ ہی حافظ ہے۔

اُن کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے بہت دیر سے بیٹھا ہوں۔ باتیں خواہ کتنی آہستگی سے کی جاتیں اُنہیں سُنائی دے جاتیں۔ بعض اوقات تو وہ خیالات تک کو سُن لیتے۔

لیکن شیطان کا رویّہ ان کے ساتھ از حد برخوردارانہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کے خیالات صدیوں سے یکساں ہیں۔ ان کی ہر بات پر شیطان بڑی متانت سے جی ہاں کہتے۔ اکثر یہ جی ہاں فقرہ ختم ہونے سے پہلے کہہ دی جاتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیطان قرض کے سلسلے میں بہت کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے کہ اس طرح اُنہیں نورِ چشمی پر لگاتار عاشق رہنے کے موقع ملتے رہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ محض مشق کر رہے ہیں۔ ان دِنوں اور کسی سے واقفیت نہیں ہے اور وہ آوٹ آف پریکٹس نہیں ہونا چاہئے۔ شیطان اس قسم کے تجربے کرنا بھی بند نہیں کرتے جیسے خواتین اپنے کوٹ کے بٹن سردیوں میں کبھی بند نہیں کرتیں۔ مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے "حالات اور بھی خراب ہو سکتے تھے۔ کیا ہوتا اگر میں اور تم چشمی ہوتے۔"

خالد اور شیطان کے درمیان کھچاؤ یا تناؤ جو کچھ بھی تھا، بدستور رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتابی قسم کے آداب برتتے۔ تصنُّعات سے کام لیتے اور اکثر خاموش رہتے۔ آخر ایک روز شیطان بولے "خالد صاحب! آپ نہایت نامعقول قسم کے انسان ہیں۔"

"رُوفی صاحب! آپ نہایت بیہودہ شخص ہیں۔" جواب ملا۔

اس کے بعد جو فقرے استعمال ہوئے وہ ناقابلِ اشاعت تھے۔

پھر شیطان نے آگے بڑھ کر خالد کو اس زور سے گلے لگایا کہ ان کی جیب میں رکھے ہوئے دو سِگار چُور چُور ہو گئے۔ "بسم اللہ! بسم اللہ! دیکھئے اب بے تکلّف ہوئے ہیں۔"

شیطان انجم کے رومان سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ زندگی میں انہیں ایک وسیع خلاء محسوس ہوتا ہے۔ ایسا خلاء جسے ایک رقیب ہی پُر کر سکتا ہے۔ کیا خبر تھی کہ زندگی میں ایسے دن بھی دیکھنے ہوں گے کہ ایک رقیب کے بغیر محبّت کرنی پڑے گی۔ اس قسم کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ کاش کہیں سے آتا۔ کوئی رقیب۔۔۔ محبّت کے سہانے اُفق پر آہستہ آہستہ جلوہ نما ہوتا یا تاریکیوں سے دفعتہً آن کودتا۔

اس سے پہلے بھی وہ رقیب کی خواہش کر چکے تھے۔ مجھ سے کہا تو میں نے معذوری ظاہر کی کہ میرے حالات ایسے ہیں کہ کم از کم سال بھر مجھے ایسے مخمصوں سے دُور رہنا پڑے گا۔ خالد سے پوچھا وہ بولے کہ میں اس قدر تبدیل ہُو چکا ہوں کہ مجھ میں اب رقیب بننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

شروع شروع میں ان کا معیار بلند تھا۔ سرد آہ سُن کر کہتے "دنیا بھر کو رقیب ملتے ہیں۔ اگر نہیں تو ہماری ہی قسمت میں نہیں۔ کاش کسی طرح آتا، کوئی رقیب، کیسا ہی ہو۔ خوبصورت اور معمولی دماغ کا، یا معمولی شکل والا اور ذہین۔ (آہستہ آہستہ معیار بدل گیا) موٹا یا بھدّا رقیب، باتونی عینک لگانے والا یا منشی فاضل، آخر میں زندہ ہو یا مُردہ۔"

اس سٹیج پر مقصود گھوڑے کو لایا گیا۔

مقصود گھوڑا ہوسٹل میں امن اور چین سے دن گزار رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا، بڑوں کا ادب کرتا، سگریٹ پیتا نہ کوئی اور چیز۔ ہر روز علی الصبح اُٹھتا اور رات کو جلد سو جاتا۔ الغرض وہ نہایت اعلیٰ پاکیزہ اور پھیکی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ماموں جان کو چند ماہ کے لیے کہیں جانا پڑا۔ انہوں نے مقصود گھوڑے کو اپنی کوٹھی کا چوکیدار مقرّر کیا اور ہدایات دیں کہ وہ کوٹھی میں منتقل ہو جائے۔ گھر کا خیال رکھے۔ یہ انتقال فوراً عمل میں لایا گیا۔

پہلا ہفتہ تو ہوسٹل کے انداز میں گزرا۔ پھر بڑے بڑے آراستہ و پیراستہ کمرے، حریری پردے، ملائم قالین، گلدان میں سجے ہوئے معطّر پھُول، جذباتی قسم کی

تصویریں، ریڈیو سے نکلتے ہوئے پُر سوز نغمے۔۔۔ مقصود گھوڑے کے اعصاب پر سوار ہونے لگے۔

گھر، کار، تجوریاں، خدا کا دیا سب کچھ تھا لیکن مقصود گھوڑا خوش نہیں تھا۔ وہ دن بدن غمگین ہوتا گیا۔ آہیں بھرنے لگتا۔ کلاس میں بیٹھا بیٹھا ایسا ہو جاتا کہ پروفیسر بھی نہ پاسکتے۔ موقع بے موقع چاند کی طرف دیکھنے سے بھی نہ چُوکتا۔ آخر ایک روز اس نے چاء پر عجیب سی گفتگو شروع کر دی۔ زندگی کے بے تکے پن پر۔۔۔ یہ کیا ستم ہے کہ ہر روز مقرّرہ وقت پر اُٹھو شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھو۔ وہی چہرہ جو بار بار دیکھا ہے، جسے دیکھ کر تعجّب ہوتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ناشتہ کرو تو وہی چاء اور وہی ڈبل روٹی کالج جاؤ تو وہی لڑکیاں، دوپہر کے کھانے کے بعد ریڈیو پر وہی ریکارڈ، ایک اور ضروری اعلان، رات کو رات کا کھانا۔۔ زندگی میں کس قدر جمود ہے۔ ایک دن دوسرے دن جیسا ہے۔ دوسرا تیسرے جیسا، تیسرا چوتھے جیسا، چوتھا۔۔۔

"تم اس جمود کو توڑتے کیوں نہیں۔" شیطان بولے۔ "صبح اُٹھ کر رات کا کھانا کھایا کرو پھر قیلولہ کرو، سہ پہر کو کالج جایا کرو۔ وہاں غسل کرو اور سنگل روٹی کا ناشتہ۔ حجّام سے شیو کراؤ اور حجّام کا شیو خود کرو۔"

"آہ! تم مجھے سمجھے نہیں۔۔۔ اس جمود کی وجہ تنہائی ہے۔" مقصود گھوڑا آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔۔ ہم سمجھ چکے تھے۔

چنانچہ اسی شام کو ایک نجومی آیا۔ ویسے ہمیں کسی نجومی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جس قسم کی زندگی ہم گزار رہے تھے اس کے لیے نجوم بیکار تھا لیکن مقصود گھوڑے کی قسمت پوچھی گئی۔ نجومی نے شیشے کے گولے کو سامنے رکھ کر ایسی زبان میں باتیں شروع کیں جیسے برما، ملایا اور چین کے سننے والوں کے لیے پروگرام ہوتا ہے۔ پھر وہ عام فہم فقرے استعمال کرنے لگا۔۔ "اب دُھند صاف ہو رہی ہے۔ وہ سامنے امریکن کار جا رہی ہے۔ وہ دیکھئے اس کا اگلا حصّہ گزر رہا ہے۔ اب درمیان کا حصّہ گزرا۔۔۔ اور اب آخری۔۔ لیجئے پوری کار گزر گئی۔۔۔ ریڈیو نما کوٹھی کے سامنے آ کر رُکی۔۔۔ یہ کون اُتر رہا ہے؟ یہ چہرے پر کیا الا بلا پہنے ہوئے ہے۔ ٹانگے کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اُفّوہ یہ تو سہرا باندھے ہوئے ہے۔ اب دُھند چھا رہی ہے۔ جتنی دیر دُھند صاف ہو مجھے ایک سگریٹ دیجئے، اور یہ کون ہے؟ ایک لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی بھوئیں اُکھیڑ رہی ہے۔ سامنے ایک نوجوان اپنی موچھیں بنا رہا ہے۔ اب وہ سرمے سے بھنویں بنا رہی ہے۔ ارے! وہ نوجوان تو یہی ہیں۔ مقصور گھوڑے کی طرف اشارہ ہو گیا۔ (انجم بھوئیں اُکھیڑتی تھی)۔

رات گئے وہی شخص شیطان سے پچیس روپے مانگنے آیا۔ شیشے کا وہ گولہ ٹوٹ گیا تھا۔

ہمیں کسی نے بتایا کہ چشمی بیمار ہیں۔ ہم عیادت کو گئے تو دیکھا کہ وہ بے حد زندہ ہیں اور گلیڈ سٹون کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ بیگم چشمی نے حسبِ معمول خالد کو نہیں پہچانا۔ خالد نے حسبِ معمول انہیں یاد دلایا۔ کہ ایک چھوٹی سی کار میں وہ ایک روز بازار گئی تھیں جہاں انہوں نے مشین پر اپنا وزن بھی کیا تھا (وزن کے کارڈ پر قسمت یہ لکھی تھی۔ ”آپ کا محبوب آپ کے لیے تڑپ رہا ہے“)۔ موٹر کی اگلی سیٹوں پر ایک تو ڈرائیور تھا اور سفید قمیض پہنے ہوئے ایک شخص۔۔۔ ”ہاں یاد ہے۔“

”وہ شخص میں تھا۔“

چشمی ڈاکٹروں کی برائیاں کرنے لگے۔ ”پہلے انہوں نے میرے گلے کے غدود نکالنے، پھر ٹانسل، پھر نصف سے زائد دانت، پھر اپینڈکس۔ اگر اُن کی بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تو کبھی کا سدھار چکا ہوتا۔ اپنے رخصت شدہ اعضاء سے ملنے۔“

”آپ مری کیوں نہیں جاتے؟“

"کیا مطلب؟" چشتی چہک کر بولے۔

"جی میرا مطلب ہے کوہِ مری۔" خالد نے وضاحت کی۔

"اوہ۔۔"

جس وقت ریڈیو پر "خون دل پسینے کو اور لختِ جگر کھانے کو" ہو رہا تھا تو خالد ایک موٹے تازے بچّے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بچّے کو فوراً اندر بھجوا دیا گیا۔

"اس بچّے کا نام کیا تھا؟" خالد نے پوچھا۔

"لطیف۔"

"اور اس کا؟" خالد نے ایک نہایت بد شکل بچّے کی طرف اشارہ کیا۔

"شکیل۔"

"اور وہ۔۔۔؟" سامنے ایک بے وقوف سی بچّی بیٹھی تھی۔

"فہمیدہ۔"

"ہم لوگ نام رکھنے میں بہت جلدی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں آٹھ دس سال کی عمر سے پہلے نام نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد بچّے کی شکل و صورت، حرکتیں وغیرہ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔"

"اور اتنی دیر تک۔۔۔ اتنے دِنوں انہیں نمبروں سے پکارا جائے؟" چشمی صاحب چِڑ کر بولے۔

"جی نہیں عارضی نام دے دیئے جائیں۔"

چشمی صاحب اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات اُن کے منتظر تھے۔

اگر آپ کو کوئی ایسا انسان نظر آئے جو تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو پھر ریل کی سیٹی یا موٹر سائیکل کی آواز سُن کر اُسے دورہ سا پڑ جائے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آواز کی سمت میں ٹکٹکی باندھ کر دیر تک دیکھتا رہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے مقصود گھوڑے کو دیکھا ہے۔ وہ نہایت کم گو اور خاموش طبیعت ہے۔ اس لیے کہ اُسے باتیں کرنی نہیں آتیں۔ آپ اس سے کوئی سوال کیجئے۔ وہ آپ کو کسی اور سوال کا جواب دے گا۔ ضدّی اتنا ہے کہ ہمیشہ اسی طرح کرے گا جس طرح اس کا جی چاہے۔ اگر اُسے منع کیا جائے تو کہیں اور جا کر اُسی طرح

کرے گا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ رقیق القلب ہے لیکن بعد میں معلوم ہُوا ہے کہ رقیق القلب ہوتا تو ایک طرف اُسے اس لفظ کے ہجےّ تک نہیں آتے۔ البتّہ وہ قنوطی ضرور ہے۔ قنوطی بھی ایسا کہ جب صبح صبح لوگوں کی گھڑیوں میں آٹھ بجتے ہیں تو اس کی گھڑی میں شام کے آٹھ ہوتے ہیں۔

"پتہ نہیں؟" اور "ہو سکتا ہے" اس کا تکیہ کلام تھا یا تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زبردست ڈپلومیٹ ہے لیکن شیطان کہتے تھے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سچ مُچ کچھ بھی پتہ نہیں اور جن کے لیے واقعی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جو دوگانۂ شُکر کو وہ پیار بھرا گانا سمجھتے ہیں جسے ایک لڑکا اور ایک لڑکی مِل کر گائیں۔

وہ پُر سوز گانے گایا کرتا۔ ہمیشہ درخت یا پودے یا کسی چیز کی آڑ لے کر تا کہ اگر اس کی طرف کچھ پھینکا جائے تو اسے نہ لگے۔ اس سوز کی وجہ کوئی ٹریجڈی تھی جو اسکی زندگی میں آئی۔ ٹریجڈی کی وجہ ایک لڑکی ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس حادثے کے بعد اُس نے کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھا یا کم از کم زیادہ دیر تک نہیں دیکھا۔

ہمارا زیادہ وقت اس کی پُر تکلّف کوٹھی میں گزرتا۔ اس کے ماموں کی کار کو لیے لیے پھرتے۔ اس کی لائبریری کی ساری جاسوسی کتابیں ہمارے لیے تھیں۔ اس

کے پیانو پر شیطان ایک عجیب و غریب راگنی بجاتے۔ خالد نے بتایا کہ وہ مصری اساوری تھی۔ انہوں نے صحراؤں میں بارہا ساربانوں کو یہی چیز گاتے سُنا تھا۔ البتّہ دور سے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ کون گا رہا ہے! ساربان یا اُونٹ؟ یا دونوں؟

اس سارے شور و غل کے باوجود مقصود گھوڑا اداس رہتا۔ کبھی وہ اپنے آپ کو ازلی کنوارا سمجھتا، کبھی ابدی کنوارا۔ خالد مشورہ دیتے کہ فوراً شادی کر لو۔ اس ملک میں کنوارا رہنا بہت مشکل ہے۔ جو یہاں پیدا ہوتا ہے اس کی ہتھیلی پر شادی کی لکیر سب سے پہلے آتی ہے۔ اگر تم سوشل ہوئے تو لوگ شُبہ کریں گے کہ لفنگے ہو اور اگر الگ تھلگ رہے تو تب بھی لوگ شُبہ کریں گے کہ لفنگے ہو۔

مقصود گھوڑا دوسرے ملکوں کی مثال دیتا جہاں لاتعداد کنوارے اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

”وہاں کی بات اور ہے۔ ان لوگوں کے مشاغل بے شمار ہیں۔ بھلا تمہارا کیا مشغلہ ہے؟“

”میں ہاکی کھیلتا ہوں۔“ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہاکی نہیں کھیلتا تھا۔ ہاکی اُسے کھیلتی تھی۔

"یہ کوئی مشغلہ نہیں۔ اور پھر وہاں لوگ اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ اُنہیں افواہیں سُننے یا پھیلانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اِدھر افواہیں ہماری زندگی کے چند گِنے گنائے مشغلوں میں سب سے اہم ہیں۔ یہی ہماری محبوب ترین تفریح ہے۔ وہ لوگ کم گو ہیں۔ ان کے مُرغے ایک دفعہ کاک اے ڈوڈل ڈو کہہ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مرغوں کی طرح دن رات ککڑوں کوں نہیں کرتے۔ مجال ہے کہ غیر ملکی اُلّو دو تین دفعہ سے زیادہ ٹُووٹ ٹُوو کہے۔ ادھر سودیشی اُلّو ہیں کہ رات بھر وہ ہاؤ ہو مچاتے ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اور قنوطیوں کے لیے تو شادی بھی ضروری ہے۔ جب تک اپنی بیزاری اپنا رنج و غم کسی اور کے بھی سر نہ منڈھا جائے زندگی کا لطف نہیں آتا۔ اگر تم نے دو تین برس اور اس طرح گزار دیئے تو وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے جب لوگ تم سے بھاگیں گے۔ دوست کترانے لگیں گے۔ ملک بھر میں ہر گھر تمہارے لیے آوٹ آف باؤنڈ قرار دیا جائے گا۔ جہاں جاؤ گے علیک سلیک کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمہاری تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تمہارے بھتیجے اور بھانجے تمہاری جائیداد کو بڑی محبّت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے اور نہایت خلوص سے تمہارے انتقال پر ملال کی دعائیں مانگیں گے۔"

مقصود گھوڑا بہت گھبراتا۔ آخر اسی گھبراہٹ میں اس نے اپنی زندگی کی ٹریجڈی سُنادی جو بالکل ویسی ہی تھی جیسی اکثر زندگیوں کی ٹریجڈیاں ہوتی ہیں۔ بھلا وہ اپنی پہلی اور سچّی محبّت کو کیونکر بھول جاتا؟

"زندگی کی پہلی اور سچّی محبّت کا علاج زندگی کی دوسری سچّی محبّت ہے۔" خالد نے اُسے بتایا۔ آخر مقصود گھوڑے نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے رشتہ داروں کو مطلع کر دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد مقصود گھوڑے کو اس مقابلے کا سامنا کرنا پڑا جو اس ملک میں تقریباً ہر نوجوان کو کرنا پڑتا ہے۔ اس مقابلے کے تین راؤنڈ ہوتے ہیں۔

پہلے راؤنڈ میں مقصود گھوڑے کی کزن آئیں۔ چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، کُنبے بھر کے شفقت بھرے فقرے بزرگوں کی نصیحتیں اور اُلٹے سیدھے جذبات۔ ایک دو لڑکیاں خاصی تھیں، لیکن یہ راؤنڈ کُنبوں کا کُنبوں کے ساتھ تھا۔ لٰہذا نہ کزنوں نے مقصور گھوڑے کی قدر کی اور نہ اس نے اُن کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ایسی شادیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ فریقین بہت جلد بے پرواہو جاتے ہیں۔ لڑکے اپنے لباس، حجامت اور رویّے کا خیال نہیں رکھتے۔ ادھر لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں۔ یہ سب درست ہو گا جب لڑکیاں اور لڑکے اقتصادی طور پر

آزاد ہو جائیں گے۔ پھر ایک دوسرے کو جیتنے کے لیے رشتہ داری کی جگہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہو گی۔ مقابلہ دوہرا ہو گا۔ اس لیے انتخاب سے پہلے اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہو گا۔ چونکہ اقتصادی آزادی میں ابھی کافی دیر ہے اس لیے مقصود گھوڑا پہلا راؤنڈ جیت گیا۔

دوسرے راؤنڈ میں دُور کی رشتہ دار لڑکیاں آئیں۔ خالہ کی چچازاد بہن کے نواسے کی بچّی کی قسم کی لڑکیاں۔ شیطان فوراً پنسل لے کر حساب لگاتے۔ جواب ہمیشہ بالکل غلط نکلتا۔ لڑکی یا تو برخوردار ہوتی یا بے حد بزرگ۔ ایک لڑکی تو تحقیقات کے بعد پوتی نکلی۔ شیطان بولے ''اس سے شادی تبھی کر سکتے ہو جب تم خود اپنے پوتے ہو۔'' اِدھر مقصود گھوڑے کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ سب اس کے والدین اور خاندان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ راؤنڈ بھی مقصود گھوڑے کا رہا۔

تیسرے راؤنڈ میں ''رشتے کی فوری ضرورت'' کے عنوان سے اشتہار دیئے گئے۔ جواب آئے، لیکن ان میں سے زیادہ ایسے تھے جو لڑکوں نے شرارتاً بھیجے تھے۔ اُن میں سے کئی کو تو ہم نے پہچان بھی لیا۔ وہ اس فعل کو بطور تفریح کیا کرتے اور اسی طرح قسم قسم کی تصویریں جمع کیا کرتے۔ بقیہ خطوط پر ہمیں شُبہ ہو گیا۔

"یہ جو لوگ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ اپنے ملک میں سب کچھ ہے پیارے۔ ایسی اچھّی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ کہاں ہیں وہ سب لڑکیاں؟" مقصود گھوڑے نے تیسرے راؤنڈ کی طوالت سے تنگ آکر پوچھا۔

"ویسے میں کئی حسین و جمیل لڑکیوں کو جانتا ہوں۔" شیطان بولے۔ "یہ دوسری بات ہے کہ فی الحال وہ دوسروں کی بیویاں ہیں اور۔۔۔۔"

"لیکن"

"جب میں ٹوک رہا ہوں مت بولا کرو۔۔۔ دراصل ہم نے اشتہار غلط دیئے ہیں کہ خاوند کے لیے بیوی کی ضرورت ہے۔ مقصود جیسا بیزار نفس اور صلح پسند انسان تو کسی عورت کی بیوی زیادہ اچھی طرح بن سکے گا۔"

ہم مقصود گھوڑے کو لے کر چشتی صاحب کے ہاں گئے۔ وہ قطب الدّین ایبک پر خفا ہو رہے تھے کہ پولو جیسا خطرناک کھیل مارکوپولو جیسے انسان سے کیوں سیکھ لیا اور مارکوپولو سے اُنہیں یہ گلہ تھا کہ بالا بالا چین کی طرف نکل گیا اور لاہور نہ آیا۔

تعارف ہُوا۔ چشتی صاحب نے فرمایا کہ مقصود نامکمل سا نام ہے۔ اس کے ساتھ اور ناموں کی طرح کوئی اضافت ہونی چاہیے۔ بُلبُل زئی، جائے نمازی، قسم کی۔

"جی یہ اپسی ہیں۔" خالد بولے۔

"اپسی کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"ان کا شجرہ ارپ ارسلان سے جاملتا ہے۔"

"مجھے ارپ ارسلان بالکل ناپسند ہے۔ خاص طور پر اس کی سیاسی غلطیاں۔۔۔۔ اور برخوردار تم کیا کرتے ہو؟"

"جی ایم اے کا آخری سال ہے۔"

"اچھا تو طالبِ علم ہو۔ اور تمہارے مشاغل کیا ہیں؟"

"ہاکی کھیلتا ہوں۔"

"یہ کوئی مشغلہ نہیں۔ مشغلے اور ہوتے ہیں۔ مثلاً دوسرے ملکوں کے ٹکٹ جمع کرنا۔ تتلیوں کے پَر اکٹھے کرنا۔ میری لڑکی انجم نے طرح طرح کی تتلیاں پکڑی ہیں۔ پڑوس میں ایک بوڑھا انگریز رہتا ہے۔ وہ اپنے فرصت کے لمحات تتلیاں پکڑنے میں صرف کرتا ہے اور اس جیسا مسرور انسان میں نے نہیں دیکھا۔ انجم نے اُسے دیکھ کر تتلیاں پکڑنی شروع کی تھیں۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ انجم درجن بھر لڑکوں سے زیادہ عقلمند ہے اور اسے سب کچھ میں نے سکھایا ہے۔ اپنی

زندگی میں مَیں نے کیا کچھن ہیں دیکھا۔ اگر اپنی سوانح عمری لکھوں تو امریکہ والے اس کی فلم بنانے کو تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ تقدیر سے ملا۔ یہ تقدیر ہی تھی کہ۔۔۔۔"

"تقدیر کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کیجیے۔ میں اس کا قائل نہیں۔" خالد بولے۔

چشمی صاحب نے ایک لمبی تقریر کی جس میں تقریر کے معنی اس کی اہمیت اور فوائد بتائے۔

خالد نے کہا "شاید آپ کو یاد ہو۔ آپ کا ایک چھوٹی مونچھوں والا دوست آپ کے پاس خوشبوئیں لایا کرتا تھا۔ اس نے خوشبوؤں کا نیا نیا کاروبار شروع کیا تھا اور وہ حوصلہ افزائی کا خواہاں تھا۔ آپ خوشبو سونگھ کر کہا کرتے کہ مجھے تو خاک پتہ نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ آپ نے عطرِ حنا درجہ خاص کے متعلق فرمایا تھا کہ شیشی سے تربوز کی بُو آرہی ہے۔

اُس نے خوشبوؤں کو بہتر بنانے کی بہتیری کوشش کی۔ آخر اس قدر بیزار ہُوا کہ کاروبار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قصور اس کی قسمت کا نہیں تھا۔ آپ کے نزلے کا تھا جو آپ کو ہر وقت رہتا ہے اور آپ کچھ بھی نہیں سونگھ سکتے۔ پرانے زمانے میں ہماری فوجوں کے پاس مڑی ہوئی تلوار کی جگہ سیدھی یورپین تلوار ہوتی تو آج

حالات مختلف ہوتے۔ مڑی ہوئی تلوار سے دشمن کو دھما دھم کوٹا جا سکتا ہے لیکن سیدھی تلوار والی چُستی اور پھُرتی ہر گز نہیں آتی۔"

چشمی صاحب خفا ہونے لگے۔

"آپ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ کا کتّا بے حد زود رنج اور چڑ چِڑا ہے۔ بات بات پر بھونکنے لگتا ہے۔ آپ کی بلّی خود غرض اور ایذا پسند ہے۔ رات بھر دھاڑیں مار مار کر روتی ہے۔ کتّے بلّیاں ایک کُنبے پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا علم شاید آپ کو نہیں۔ پالتو جانوروں کی خصلت کُنبے کے افراد کے تحت الشُعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک تندرست کتّا ایک خوش طبع بلّی گھر کی مسرّتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ذرا سی غلطی سے کئی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں۔ تعجّب ہے کہ ہم لوگ اس طرف ذرا بھی توجّہ نہیں دیتے۔ ذرا اپنے کتّے بلّی کو بلایئے تو سہی۔ میں نے مشرقِ وسطیٰ میں جانوروں کا نجوم اور قیافہ شناسی سیکھی ہے۔"

کتّا بلّی لائے گئے۔ خالد نے دونوں کے پنجے دیکھے۔ پھر اُن کے ناموں کے الفاظ کو کاغذ پر لکھ کر حساب لگایا اور افسوس سے سر ہلایا۔ "کتّے پر زُحل کا سایہ ہے۔ یہ شہرت کا خواہشمند ہے۔ اس گھر میں اسے شہرت نہیں ملے گی۔ چنانچہ یہ خونخوار

بن جائے گا۔ بلّی کی قسمت کی لکیر غائب ہے۔ اس کا ستارہ گردش میں ہے۔ آپ ان دونوں کو کہیں دُور بھجوا دیں۔ کل تک ایک تندرست کتّا اور ایک ہشاش بشاش بلّی آپ کے ہاں پہنچ جائے گی۔ پھر دیکھئے کتنا فرق پڑتا ہے اور یہ بہت سی خالی بوتلیں کیسی ہیں؟"

چشتی صاحب نے مشکل سی زبان میں ایک بیماری کا نام لیا جس سے جوڑوں میں درد ہو جاتا ہے۔ "یہ بیماری مجھے پیدائش سے ہے۔ اپنے جوڑوں کو باقاعدہ استعمال نہیں کر سکتا۔ آج تک کبھی تیز نہیں چل سکا۔ حسرت ہی رہی۔"

"مجھے بھی یہی بیماری تھی لیکن مشرقِ وسطےٰ کے ایک تیر بہدف نسخے نے اسے غارت کر دیا۔ اس کی دوائی کتّے بلّی کے ساتھ بھجوا دوں گا۔"

مقصود گھوڑے نے ایک چھوٹا سا جال خریدا اور بڑے جوش و خروش سے تتلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ اِدھر بوڑھا انگریز نِکلتا اُدھر مقصود گھوڑا منتظر ہوتا۔ وہ آگے آگے یہ پیچھے پیچھے گھنٹوں یہی شغل رہتا۔ اکثر یہ تعاقب بے سود ثابت ہوتا۔ کبھی کبھار ایک دو تتلیاں جال میں آ جاتیں تو مقصود گھوڑا سوچنے بیٹھ جاتا کہ اب ان کا کیا کروں۔

میں نے صبح صبح عجب روح پرور نظارہ دیکھا۔ چشمی سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے وہی خالد کا ارسال شدہ کتّا ہے۔ مجھے دیکھ کر کتّے نے بریکیں لگائیں۔ چشمی دُور تک ویسے ہی بھاگتے چلے گئے۔ آواز دے کر بُلایا۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور شکایت کی کہ یہ حادثہ آج ساتویں مرتبہ ہوا ہے۔ جونہی وہ صبح باغ کا رُخ کرتے ہیں یہ نامعقول کتّا فوراً بھونکتا ہُوا کاٹنے کو دوڑتا ہے اور دوڑ لگتی ہے۔ حتیٰ کہ کتّا تھک جاتا ہے۔ ادھر وہ کمبخت بلّی دُودھ اور بالائی کی دشمن بن گئی ہے۔ چار چار قفل لگادو لیکن وہ کسی نہ کسی طرح چٹ کر جاتی ہے۔

''اور وہ آپ کے جوڑوں کا درد؟''

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولے: ''اُفّوہ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ درد کی وجہ سے چلنا پھرنا محال ہونا چاہیے۔''

کیفے میں انجم کا مقصود گھوڑے سے تعارف کرایا گیا۔

شیطان بولے ''تمہاری زلفیں حکم کے یکّے جیسی سیاہ ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی سیاہ ہیں۔''

''آپ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔''

"تم بھی کچھ ایسی بُری نہیں لگ رہیں۔"

شیطان اور انجم اس انداز سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ آس پاس بیٹھے ہوؤں کو گھر یاد آنے لگا۔ حالانکہ وہاں بیشتر لوگ ایسے تھے کہ اگر وہ گھر میں ہوتے بھی تب بھی ایسا نظارہ میسّر نہ آتا۔

مقصود گھوڑے سے دوسری مرتبہ تعارف کرایا گیا تو اس کی کار کا بھی ذکر ہوا۔ کار کا ذکر سُنتے ہی انجم چونکیں۔

"کون سا ماڈل ہے؟" ماڈل بتانا تھا کہ وہ مقصود گھوڑے کے ساتھ جا بیٹھیں۔

الغرض پورے ساڑھے پانچ بجے انجم مقصود گھوڑے کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے کار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ بھول گئے کہ وہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ صرف مقصود گھوڑا اور انجم رہ گئے۔۔۔ اور کار۔

اگلی صبح مقصود گھوڑے نے شیو کرتے وقت بُرش کئی مرتبہ چاء کی پیالی میں ڈبویا اور حجامت کے گرم پانی کا پیالہ اٹھایا۔ پھونک مار کر صابن کے جھاگ ہٹائے اور چند گھونٹ بھرے۔ اُسے کئی چرکے بھی لگے جن سے خون نکالنا اُسے یاد نہ رہا۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے انجم کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انجم نے سب کچھ سن کر ایضاً کہا اور بتایا کہ انہیں بھی اس سے سو فیصدی اتفاق ہے لیکن وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے روز سہ پہر کو انہیں کار کی ضرورت ہو گی۔

مقصود گھوڑے کی زندگی میں انقلاب آ گیا!

اب اس کا روزانہ پروگرام حسبِ ذیل تھا۔

علی الصبح اُٹھ کر تتلیاں پکڑ تا۔ کالج، سہ پہر کو انجم سے اظہارِ محبّت کر کے یہ جواب لینا کہ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے سہ پہر کو انہیں کار چاہیے۔ پھر تتلیاں پکڑنا۔ شام کو سوچتے رہنا کہ پکڑی ہوئی تتلیوں سے کیا سلوک کیا جائے۔

خالد نے بتایا کہ کتّے نے چشتی صاحب کے جوڑوں کے درد کا مکمل علاج کر دیا ہے۔ بلکہ بھاگ کر اب کتّے کے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا ہے۔ بلّی نے دُودھ اور بالائی پر ہلّہ بول کر چشتی خاندان کی تین ضرورت سے زیادہ موٹی خواتین کو دُبلا کر دیا ہے۔ اب وہ تینوں قدرے خوبصورت ہو گئی ہیں۔ اُن میں انجم بھی ہے۔ چشتی صاحب کے اُلٹے سیدھے خواب ختم ہو چکے ہیں۔ اُن کے

ہاضمے کا فتور بھی رفع ہو چکا ہے۔ خالد کی بھیجی ہوئی تیر بہدف دوائی دراصل ہاضمے کا مکسچر تھا۔

لیکن خالد اور چشمی کی زبردست ڈوئل ہوئی۔

ہم چشمی کے ہاں چاء پر مدعو تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ ان مخلص اور جاں نثار رفیقوں کو انہوں نے ایک ایک کر کے چُنا تھا۔ اپنے عزیزوں کو ایک ایک کر کے سدھایا تھا۔ اب اُن کی زندگی کا سرمایہ یہی لوگ تھے۔ قسمت دغا دے سکتی تھی مگر یہ لوگ قابلِ اعتماد تھے۔ پھر انجم کی تعریفیں ہونے لگیں۔ مقصود گھوڑے نے فوراً تتلیوں کا ذکر چھیڑ دیا کہ وہ ہر روز تتلیاں پکڑتا ہے اور یہ مشغلہ اُس کی زندگی میں متعدد خوشگوار تبدیلیاں لے آیا ہے۔ مگر وہ بوڑھا انگریز تو یونہی بے وقوف سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اس عمر میں ایسا مشغلہ کتنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

”وہ بے وقوف نہیں، آرٹسٹ ہے۔ وہ تتلیوں کے پروں کے ڈیزائن چُن کر انگلستان کی ایک مشہور کپڑے کی فرم کو بھیجتا ہے۔ کمپنی نے اُسے صرف اسی لیے ملازم رکھا ہے۔“ خالد نے بتایا۔

”ممکن ہے یہ سب فراریت ہو۔ بھلا بوڑھوں کو رنگین چیزوں سے کیا واسطہ؟“ چشمی نے محض بحث شروع کرنے کے لیے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ فراریت ہو، لیکن فراریت کہاں نہیں، مذہب، آرٹ، موسیقی سب فراریت ہے۔ ہم بھوک سے فرار ہونے کے لیے کھانا کھاتے ہیں۔ ابدی تنہائی سے فرار ہو کر دوست بناتے ہیں، شادی کرتے ہیں۔ جانوروں کی طرح ریوڑوں میں رہنا ہم نے اسی سلسلے میں اختیار کیا اور پھر زندگی بھی تو فرار ہے۔ اُس حالت سے جو زندگی سے پہلے چھائی ہوئی تھی۔۔۔“

”زندگی کو تم فرار بتاتے ہو۔ لا حول ولا۔ زندگی تو جدوجہد ہے۔ مستقل جدوجہد۔ یہ عمل چاہتی ہے۔ عمل اور فرار دو متضاد چیزیں ہیں۔ میری زندگی کو لو۔ اس کا ایک ایک لمحہ میں نے خود ترتیب دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی زندگی بھی ایسی ہی اعلیٰ ہو گی۔“

”اگلی وگلی زندگی کچھ نہیں ہو گی۔ بس یہی ایک زندگی ہے۔ موت کے بعد وہی کچھ ہو سکتا ہے جو پیدائش سے پہلے تھا یعنی نامعلوم۔ آپ کو اپنی پیدائش سے پہلے کا کوئی واقع یاد ہے؟ آپ چشمی ہیں کیونکہ آپ اتفاق سے ایسے خاندان میں پیدا

ہوئے جو چشمی کہلاتا تھا۔ آپ جاپانی بھی ہو سکتے تھے یا جنوبی امریکہ کے کسی ہوٹل میں ڈھول بجانے والے۔"

"ایسے خیالات تو صرف دہریوں کے ہو سکتے ہیں، جنہیں مذہب سے کوئی سروکار نہ ہو۔" چشمی حقارت سے بولے۔

"شاید آپ نے سُنا ہو گا کہ ایٹم کی نئی تھیوری کے مطابق انسان زمین کا ایک بہت بڑا حصّہ تباہ کر سکتا ہے۔ اگر یوں ہو جائے تو چاند کی کشش پر اثر پڑے گا اور چاند اس نظام سے نِکل کر کسی سیارے سے ٹکرائے گا یا کسی دوسرے نظام میں شامل ہو جائے گا۔ یعنی انسان چاہے تو نظام بھی بدل سکتا ہے۔ پھر نہ چاندنی راتیں ہوں گی اور نہ یہ چاند زدہ شاعری (آشوب چشمی بھی اسی قسم کے شاعر تھے۔) ممکن ہے نظامِ شمسی خود بدل جائے کیونکہ سورج بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گیارہ کھرب سال تک بالکل سرد ہو جائے گا۔"

"اچھا؟" چشمی صاحب کرسی سے اچھل پڑے۔ وہ ڈر گئے تھے۔ "کیا کہا کتنے عرصے میں؟"

"گیارہ کھرب سال۔"

"اوہ!" وہ مُسکراتے ہوئے بولے "میں سمجھا گیارہ ارب سال۔"

"اور پھر دنیا کے سب مذہب بخشش کا وعدہ کرتے ہیں۔ ان کروڑوں انسانوں کا کیا حشر ہو گا جو مذہب سے پہلے اس دنیا پر آباد تھے۔ یا وہ جو دنیا سے بے خبر دُور دراز گوشوں میں رہتے ہیں جہاں مذہب نہیں پہنچا۔"

"لیکن تمام مذاہب کے قوانین ایک سے ہیں۔ نیکی، بدی، گناہ، سزا، ہر دماغ انہیں سمجھ سکتا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ کسی کتاب میں لکھ کر پیش کیا جائے۔" چشمی بولے۔

"مگر دنیا کے مختلف حصّوں میں حالات مختلف ہیں۔ اس کے کچھ حصّے اس قدر سرد ہیں کہ وہاں پانی کی جگہ لوگ شراب پیتے ہیں۔ اگر وہ شراب نہ پئیں تو زندہ نہ رہ سکیں۔"

"شراب نوشی کسی حالت میں جائز نہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شراب کا صرف ایک مقصد ہے۔ خواہ گرمی ہو یا سردی۔ افریقہ ہو یا روس۔" چشمی اَڑ گئے۔

"کل میں نے آپ کے فریجیڈیئر میں بئیر کی بوتلیں دیکھی تھیں۔ شاید اب تک وہیں ہوں۔۔۔لائیے یہ تجربہ بھی ہو جائے" پڑوس سے تین گدھے لائے گئے۔ ایک بالٹی میں بئیر اور لیمونیڈ ڈال کر شینڈی بنائی گئی اور گدھوں کو پلائی گئی۔ ایک گدھا تو فوراً آؤٹ ہو گیا اور آنکھیں موند کر وہیں سو گیا۔ دوسرے نے

خرمستیاں شروع کر دیں۔ نعرے لگائے اور دولتیاں جھاڑیں، کرسیوں کو پھلانگ گیا۔ گلدستے کھا گیا۔ تیسرا گدھا خاموش تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا۔ کتابوں اور تصویروں کی طرف بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آخر پیانو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ خالد کی فرمائش پر ایک جذباتی قسم کا نغمہ بجایا گیا تو گدھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چشمی صاحب طیش میں آ گئے۔ گدھوں کو باہر نکال دیا گیا۔ وہ گرج کر بولے۔ ”یہ نئی پود کس قدر گستاخ ہے۔ ہر چیز کا مذاق اُڑاتی ہے۔ زندگی پر انہیں یقین نہیں۔ مذہب سے یہ منکر ہیں۔ خوابوں کے یہ قائل نہیں۔ کل کو کہہ دیں گے کہ روح پر بھی عقیدہ نہیں۔“

”آپ رُوح دکھا دیجئے، تو یقین کر لیں گے۔“ خالد نے کہا۔

”روح نظر کیونکر آ سکتی ہے؟“

”تو اس کی موجودگی ہی محسوس کرا دیجئے۔“

اُنہوں نے بتایا کہ پڑوسی کی کوٹھی آسیب زدہ ہے۔ کبھی وہاں ایک بدنصیب عاشق کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہر رات اس کی روح نالہ و شیون کرتی ہے۔ صبح کاذب

کے وقت تو ایسی دل دوز صدائیں آتی ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ چشمی صاحب کے دائمی نزلے کی یہی وجہ ہے۔ وہ پچھلے پہر بلا ناغہ روتے ہیں۔

رات بھر ہم جاگتے رہے۔ صبح کے وقت آوازیں آنی شروع ہوئیں تو چھت سے ہوتے ہوئے دوسری کوٹھی پر پہنچے۔ یہ آواز نالہ و شیون کی ہرگز نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ کچھ ڈر بھی لگا۔ سیڑھیاں اُتر کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے غرارے کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کا گلا ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ علی الصبح اُٹھ کر وہ نمکین پانی کے غرارے کرتے ہیں۔ اب کچھ افاقہ ہے۔

چشمی صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ ہم لوگوں سے ہرگز بحث نہیں کریں گے۔ ”تم لوگ نہ صرف گستاخ ہو بلکہ تمہاری بے معنی گفتگو سے میرے نظریات خراب ہو رہے ہیں۔“

وہ تینوں گدھے ہر شام کو چشمی صاحب کے مکان کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ بڑی مشکل سے انہیں بھگایا جاتا۔ کئی دنوں تک ایسا ہوا۔

محبّت مقصود گھوڑا کر رہا تھا اور شرم ہمیں آ رہی تھی۔ انجم کے دل میں اُس کے لیے نہایت کار آمیز اور کار انگیز جذبات تھے۔ پھر بھی مقصود گھوڑے کے رومان کی رفتار غیر تسلّی بخش تھی۔

انجم کے بارے میں خالد کی رائے کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ اگر وہ باذاق ہوتی تو صبح صبح کبھی کبھی ایوننگ اِن پیرس نہ لگائی۔ کاہل بھی تھی۔ ایک مرتبہ خالد سے ایک انار کٹوایا، چھلوایا، دانے نکلوائے، نمک چھڑکوایا، پھر جمائی لے کر بولی۔ "اب آپ ہی اسے کھا بھی ڈالیے۔"

خالد اور چشتی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چشتی کو خالد کے نظریوں سے نفرت تھی۔ خالد انہیں نظریوں کا فلسفہ سمجھاتے کہ فضا میں ہر قسم کی ریڈیائی لہریں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ مسرور، غمگین، دہشت انگیز، صلح آموز۔ یہ اپنی پسند ہے کہ ریڈیو کو کس طرح ٹیون کیا جائے، لیکن چشتی صاحب سمجھنے سے انکار کر دیتے۔ خالد کہا کرتے کہ اس شخص کو دیکھ دیکھ کر مجھے بنی نوع انسان سے نفرت ہوتی جارہی ہے۔

کبھی کبھی شیطان کو رضیہ کی یاد ستاتی۔

"رضیہ چار سال پہلے کتنی سیدھی سادی تھی۔" وہ کہا کرتے۔

"اور ہم چار سال پہلے کتنے سیدھے سادے تھے۔" میں کہا کرتا۔

وہ رقیب والا پروگرام بھی التوا میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ مقصود گھوڑے کی بے قدری تھی۔ اِدھر اس کا ایم اے والا مسئلہ دنیا کے مسائل کی طرح ادھورا پڑا تھا۔

وہ جمود جو مقصود گھوڑے کی زندگی سے نکلا شیطان کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ بعض اوقات لوگوں کو چاء پر بُلایا جاتا، اس تقریب پر کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اِسی قسم کی ایک تقریب پر انجم اپنی چند سہیلیاں لے کر آئیں۔ اُن میں سے ایک فارسی پڑھی ہوئی تھیں۔ شیطان کو ایران سے ہمیشہ دلچسپی کا اظہار رہی ہے۔ چنانچہ وہ ان خاتون سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ ویسے وہ خود بھی ہر لڑکے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

"اس طرح آگے آگے مت چلیئے۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔" انجم نے کہا اور شیطان ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ایک سوال کر سکتا ہوں؟"

"کیجئے۔"

"یہ فارسی زدہ لڑکی کون ہے؟"

"کسی کی منگیتر ہے۔"

"اسے فارسی میں کہہ دیجئے کہ یہ دوسری منگیتروں کے لیے بُری مثال قائم کر رہی ہے۔"

"یہ اکیلے اکیلے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" مقصود گھوڑا لپک کر آیا۔

"کچھ نہیں انجم کل گھڑ دوڑ پر جانا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا یہیں دوڑ لیں گے۔" شیطان بولے۔

مقصود گھوڑے نے موقع ملتے ہی اپنی مخصوص گفتگو شروع کر دی۔

"تم پان بہت کھاتی ہو۔ کہیں عادت نہ پڑ جائے۔"

"دس سال سے کھا رہی ہوں۔ اب تک تو عادت نہیں پڑی۔"

"انگیٹھی پر جو تمہارا فوٹو رکھا ہے، نہایت خوبصورت ہے۔ تمہاری شکل سے بالکل نہیں ملتا۔"

اس کے بعد اُس نے منگنی کی انگوٹھی کا ذکر کیا۔ انجم جلدی سے بولی "مجھے منگنی کی انگوٹھی بالکل پسند نہیں۔ یہ ایّامِ جاہلیت کی یاد دلاتی ہے۔ پرانے زمانے میں

منگنی کے بعد لڑکی کی گردن میں لوہے کا طوق پہنا دیتے تھے۔ مہذّب ہونے پر صرف ایک کلائی میں ہتھکڑی پڑنے لگی۔ پھر چوڑی آئی اور آخر میں انگوٹھی۔"

"یہ پھول لو گی؟"

انجم نے پھول سُونگھے۔ خوشبو نہیں تھی۔ پھینک دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ شیطان سے کہہ رہی تھیں۔ "جیسے پھول آپ لاتے ہیں کوئی نہیں لاتا۔"

شیطان کی عادت تھی کہ رنگ برنگے ولائتی پھولوں کو چنبیلی، حنا خس وغیرہ کی خوشبو میں بسا کر انجم کو دیا کرتے جو سونگھتا حیران رہ جاتا۔

"اور جیسے خط میں لکھتا تھا ویسے کوئی لکھتا ہے؟"

شیطان کے محبّت نامے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نرالے ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک لڑکی کو صرف یہ لکھ کر بھیجا

؟

جواب آیا۔۔

!

ایک محبّت نامے کے اختتام پر انگوٹھا لگا دیا۔ دوسرے میں العبد اور گواہ شُد بھی شامل کیا۔

خالد بڑے زور و شور سے کتّوں کی نفسیات پر بحث کر رہے تھے۔ غالباً انہوں نے کوئی غیر معمولی کتّا دیکھ لیا تھا۔

"آپ نے یہ علم کہاں سیکھا؟" فارسی زدہ خاتون نے خالد کے قریب آ کر پوچھا۔

"مصر میں۔"

"اہرامِ مصر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ اور بھی قریب آ گئیں۔

"مصر میں اب ان کی وہ وقعت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک دو مرتبہ پولیس نے گولی بھی چلائی۔ اس جماعت کو اب ختم ہی سمجھیے۔"

"وہاں یہ علم کس زبان میں سکھاتے ہیں؟"

"فارسی میں۔"

خالد سے کریما بہ بخشائے بہر حالِ ما والے کا شعر کا ترجمہ کرایا گیا جسے خالد نے یوں کیا۔۔۔ کریما بہ بخشا جو بر حالِ ما تھا اور ہستم اسیرے جو ہے وہ کمندِ ہوا ہے۔

ہمیں علم تھا کہ خالد انگلستان جاتے وقت ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ واپسی بھی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ان کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی اُن خاتون کی میکسیکو کے بارے میں۔

اتنے میں اطلاع ملی کہ مقصود گھوڑا امتحان میں فیل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ دُھند سی چھانے لگی۔ ہر شے میں اس خبر کی آمیزش ہوتی گئی۔ بڑا سہانا سماں تھا۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ خوشگوار فیل شدہ دھوپ میں رنگین پھولوں کی خوشبوئیں مچلنے لگیں۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے فیل شدہ چاءپی اور فیل شدہ حسین غروبِ آفتاب دیکھ کر لوٹے۔

چشمی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مقصود گھوڑا دیو جانسن کلبی سے بھی زیادہ نکمّا ہے اور خالد اور شیطان خود تو گمراہ ہو چکے ہیں دوسروں کو بھی بہکا رہے ہیں۔ چشمی صاحب اپنے بچوں کو ایسے دہشت پسندوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور محفوظ رکھنے لگے۔

مجھے کچھ دنوں کے لیے باہر جانا پڑا۔ لوٹا تو عجیب خبر سننے میں آئی کہ مقصود گھوڑے نے حیرت انگیز کارنامہ دکھایا ہے۔ شہر بھر میں مقصود گھوڑے کا نام مشہور ہو چکا تھا۔

شہر سے باہر ایک سُرخ سا پتھریلا ٹیلہ تھا جس کے چاروں طرف پانی تھا۔ مشہور تھا کہ یہ کسی قدیم آبادی کا کھنڈر رہے۔ مقصود گھوڑے نے ایک ٹیلے کو کھدوا کر ایک تاریخی شہر کے آثار برآمد کیے تھے۔ کھدائی میں طرح طرح کی چیزیں نکلیں۔ مٹّی کے برتن، ٹوٹے ہوئے مجسمے، مٹکے، زنگ آلود ہتھیار، منکوں کے ہار، گھسے ہوئے سِکّے۔ ماہرین کا خیال تھا کہ یہ شہر حضرت عیسٰے علیہ السّلام کی پیدائش سے پہلے آباد تھا اور ٹیکسلا کا ہم عصر تھا۔ اپنے وقت میں ایشیائی تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

اخباروں میں مضامین نکلنے لگے۔ نامہ نگار مقصود گھوڑے کو ہر وقت گھیرے رہتے۔ مقصود گھوڑا جہاں جاتا اُنگلیاں اُٹھتیں۔ وہ دیکھو ملک کا مایہ ناز سپوت جا رہا ہے جس نے ایک قدیم شہر دریافت کیا ہے۔ شیطان نے اصرار کیا کہ مقصود گھوڑے کا نام بھی کوئی ماڈرن قسم کا رکھا جائے۔ لوگ رات کو عبدالکریم اور قطب الدّین سوتے ہیں اور صبح اے۔ کے۔ غزنوی اور کیو ڈی نجمی ہو کر اُٹھتے ہیں چنانچہ مقصود گھوڑے کا نام ایم جی اسپی رکھ دیا گیا۔ ہر روز طرح طرح کے دعوت نامے آتے۔ حضرت ایم جی اسپی مدظلّہ کو مشاعروں کا صدر بنایا جاتا۔ پبلک جلسوں میں ان سے درخواست کی جاتی کہ قدیم تہذیب پر تقریر فرمائیں۔ ایم جی اسپی زندہ باد کے نعروں سے شہر گونجنے لگتا۔ اسپی سائیکل ورکس، اسپی گھی

سٹور اور اپسی لانڈری کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ان سے شفا خانہ حیوانات کی افتتاحی رسم ادا کرائی گئی۔ رسالوں میں اس قسم کے مضامین نکلنے لگے۔ اپسی بطور سیّاح (از خالد) خالد بطور ادیب (از رُوفی) رُوفی بطور دوست (از خالد) رُوفی بطور دوست (از اپسی) اپسی بطور دوست (از رُوفی) رُوفی بطور سیّاح (از اپسی) خالد بطور انسان (از رُوفی)۔

چشمی صاحب کا رویّہ بدل چکا تھا۔ مقصور گھوڑے کی کار پر انجم کی توجّہ پھر ہونے لگی۔ چشمی اور خالد نے نئے سِرے سے بحثیں شروع کر دیں۔ چشمی قبل از مسیح زمانے کے مدّاح تھے۔ اُن کی رائے میں وہ لوگ بہت آگے نکل چکے تھے۔ اُڑن کھٹولے ہوائی جہازوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ کچھ اُونچے ہی اڑتے تھے۔ موجودہ زمانے کی ساری ایجادوں کا ذکر پرانی کتابوں میں آ چکا ہے۔ اُن دنوں نجات حاصل کرنے کا بہت اچھا رواج تھا جو زندگی کی اُلجھنوں سے تنگ آ جاتا اُسے حکومت کی طرف سے ساری سہولتیں میسّر ہوتیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نروان حاصل کر لے۔

یہ مباحثے اکثر ناخوش گوار کلمات پر ختم ہوتے۔ ایک روز تو ہم خالد کو بمشکل گھسیٹ کر لائے۔ کھدائی سے جو عجیب اوزار بر آمد ہوئے تھے، چشمی کا خیال تھا

کہ وہ ادویات کشید کرنے کے آلات تھے۔ خالد کہتے تھے کہ وہ بھنگ گھوٹنے کے اوزار تھے۔ چشتی نے خالد سے کہا کہ برخوردار تم وقت سے بہت پہلے دنیا میں آ گئے ہو۔ خالد بولے، قبلہ آپ اپنے وقت کے بہت بعد تشریف لائے ہیں۔ دراصل آپ کا تعلّق قبل از مسیح کے زمانے سے ہے۔

اُن دونوں کی صلح کرانے کے لیے ایک پکنک کیا گیا جس میں شکار کا پروگرام بھی تھا۔ شیطان نے دو تیتر ہلاک کیے۔ ایک بڑا سا پرندہ خالد کے سامنے سے گزرا۔ انہوں نے پرانی توڑے دار بندوق سے نشانہ لیا اور داغ دی لیکن کچھ نہ ہُوا۔ بندوق نہیں چلی۔ اتنا بڑا پرندہ یوں سامنے سے نکل جانے پر سب کو افسوس ہوا۔ توڑے دار بندوق کے مؤجد کے متعلق نہایت غیر مہذّب فقرے استعمال کیے گئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ زبردست دھماکا ہوا اور خالد کے کندھے پر رکھی ہوئی توڑے دار بندوق خود بخود چل گئی۔ اُدھر چشتی صاحب جو پیچھے آ رہے تھے دھم سے ِگرے۔ سب سمجھے کہ بندوق نے اپنا کام کر دیا۔ لیکن چشتی صاحب صرف بیہوش ہوئے تھے۔ ہوش میں آنے پر معلوم ہوا کہ بالکل بہرے ہو چکے ہیں۔ دھماکہ اُن کے کان کے قریب ہوا تھا۔

انجم نے مقصود گھوڑے سے شکار کے متعلق پوچھا تو اس نے انگلیوں پر گِن کر بتایا۔ ایک ہرن، دو تیتر اور ایک چشمی صاحب!

ڈاکٹروں نے بتایا کہ فی الحال اُن کی سماعت بے کار ہو چکی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ بہرا پن عارضی ہو۔

کھدائی میں کسی پُرانی زبان میں لکھے ہوئے کتبے بھی نکلے جن کا ترجمہ شیطان نے ایک پروفیسر سے کرایا۔ ایک کتبے میں لوگوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ پہلے خوب گناہ کریں۔ پھر پچاس برس کی عمر میں توبہ کر کے عبادت شروع کریں تاکہ دنیا سے بھی واقفیت ہو جائے اور دین سے بھی۔ اس قسم کی بہت سی مفید باتیں شیطان نے اخبار میں چھپوائیں۔ پڑھنے والوں نے اشتیاق ظاہر کیا کہ کھدائی سے جو تختیاں اور کتبے برآمد ہوں ان سب کا ترجمہ کرایا جائے چنانچہ شیطان کا ایک اور ترجمہ چھپا جو کچھ یوں تھا۔

اِس عجوبہ روزگار شہر کی داغ بیل یونانیوں نے ڈالی اور اصلی باشندوں میں بہت جلد گھُل مِل گئے چنانچہ بہت جلد یونانیوں کا نام و نشاں تک نہ رہا۔ اِس شہر کا ماضی نہایت شاندار تھا لہٰذا باشندوں کی نگاہیں ہمیشہ ماضی کی طرف رہیں۔ ماضی بعید کی طرف یا زیادہ سے زیادہ ماضی تقریب کی طرف۔ زندگی کی مشکلات سامنے

آتیں تو وہ پرانی روایتوں کے ذکر سے اُن کا مقابلہ کرتے۔ نئی آبادیوں پر کھنڈروں کو ترجیح دیتے۔ کھنڈروں کو دیکھ کر پُرانی باتیں یاد آنے لگتیں اور دل کو کمال درجے کا سکون حاصل ہوتا۔ باشندوں کو رنج والم سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ دن رات غمگین اور بیزار رہتے۔

سست الوجود تھے اس لیے اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں پچیس گھنٹے سوئے رہتے۔ یہ نیند عجیب تھی کہ چل پھر رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں مگر خوابیدہ ہیں۔ چونکہ جذباتی تھے اس لیے دوسروں سے خواہ مخواہ کی توقعات رکھتے۔ انسانوں سے توقعات، غیر مرئی چیزوں سے توقعات۔ کوئی ان کے لیے کچھ کر دے۔ کوئی کہیں سے آکر کچھ دے جائے۔ جب کچھ نہ بن پڑتا تو مذہب پر اُتر آتے۔ باشندوں کو دعاؤں پر اس قدر عقیدہ تھا کہ کام وام چھوڑ کر بس دعائیں مانگتے رہتے۔ بارش آندھی زندگی، موت، گھڑ دوڑ، سٹّا، ہر چیز کے لیے مختلف دعائیں تھیں اور دل کھول کر مانگی جاتی تھیں۔

یہ مضمون چھپا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ چشتی صاحب نے تو بہت ہی پسند فرمایا اور مشورہ دیا کہ شیطان اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ مزید معلومات فراہم کر کے ”ٹیکسلا سے پہلے“ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھیں۔ بہت ممکن ہے کہ

انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے۔ مشورہ معقول تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اسی سلسلے میں ایک اور ترجمہ چھپوایا گیا جو یوں تھا۔

آب و ہوا: خوش قسمتی سے پہاڑوں کی ترائی میں خوب بھنگ اُگتی تھی۔ لہٰذا ہوائیں بھنگ کے بخارات سے بوجھل ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ بارشوں کے ساتھ خوب مستی و قلندری برستی۔

فنونِ لطیفہ: قوّالیاں، مشاعرے، کبڈی اور دیگر فنونِ لطیفہ زوروں پر تھے۔

صنعت و حرفت: باریک ململ کی دھوتیاں، نازک صراحیاں، اعلیٰ درجے کے تہمد، دیدہ زیب چلمیں، دساور کو بھیجی جاتی۔

غذا: باشندوں کی خوراک نہایت صحت بخش تھی۔ غذا کا اصلی جزو سُرخ مرچیں اور بناسپتی گھی تھا۔ ان دونوں میں کبھی چاول یا سبزی کی آمیزش کر دیتے۔ کبھی گوشت کی تہمت لگا دیئے۔ خوراک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر خمار چڑھنے لگتا اور نیند آ جاتی۔ جب آنکھ کھلتی تو چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا۔ ان ہی مرچوں اور گھی کا اثر سیاست پر تھا۔ ان ہی کا دخل شاعری اور ادب میں تھا۔ موسیقی میں بھی یہی کار فرما تھیں۔

لباس: ایسا اعلیٰ اور موزوں تھا کہ اچھا بھلا انسان پہن لے تو الف لیلہ کا کردار معلوم ہونے لگے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ موسم کے تغیّر و تبدل سے ہرگز نہیں بچاتا تھا۔ ہر وقت کی دھوپ سے چہرہ سنولا جاتا، پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اگلی نسل میں یہ تبدیلیاں مستقل ہو جاتیں۔

تہذیب و تمدّن: باشندے بڑے مہذّب تھے۔ ہر وقت باتیں کرتے رہتے۔ گفتگو کرتے وقت دل و دماغ کے مابین سلسلۂ آمد و رفت منقطع ہو جاتا اور یہ قطعاً پتہ نہ رہتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب باتیں کر چکتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے۔

تمدّن: تمدّنی لحاظ سے تین طبقے مشہور تھے۔

پہلا طبقہ: یہ لوگ موقع کے مطابق ہر چیز کے طرفدار بھی تھے اور مخالف بھی۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ مخالفین کو برابر برابر چھڑوا دیا جائے۔ اپنی رائے گول مول الفاظ میں دیتے کہ کہیں کوئی خفا نہ ہو جائے۔ اس طبقے کو ابن الوقت مدرسۂ فکر بھی کہا جاتا تھا۔

دوسرا طبقہ: اس جماعت کے ممبر یا تو گھروں سے بھاگے ہوئے تھے یا وہ تھے جو مدرسے میں بار بار فیل ہوئے۔ یہ SUCKERS کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی نے ایک دن بھی ایمانداری سے کام نہیں کیا تھا۔ چونکہ خود زندگی کے ہر شعبے

میں ناکامیاب رہے۔ اس لیے دنیا بھر کے دشمن تھے۔ یہ طبقہ ایسا نظام چاہتا تھا جس میں محنت مشقت دوسرے لوگ کریں اور آسائشیں اُن کو میسّر ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ چند ملک ایسے بھی ہیں جہاں حالات ان کی توقعات کے مطابق ہیں۔ لیکن انہیں نہ سیاحت کا شوق تھا نہ کبھی گھر سے باہر گئے تھے۔ ان کی معلومات سُنی سُنائی باتوں یا غیر مُلکی پراپیگنڈے پر مبنی ہوتیں۔ کئی مرتبہ اُن سے کہا گیا کہ دنیا بھر میں کہیں ایسا معاشی نظام نہیں ہے جس میں محنت و مشقت سے جی چرانے والوں کی کھپت ہو سکے۔ اگر کوئی ایسی جگہ آپ کو معلوم ہے تو آپ وہاں چلے کیوں نہیں جاتے؟ لیکن یہ جہاں تھے وہیں ڈٹے رہے۔ یہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ۔ لوگوں کو بتاتے کہ اگر انسان کوشش کرے تو پینتیس روپے کچھ آنے ماہوار میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لیکن خود آسودہ زندگی بسر کرتے۔ دن بھر زہریلے مضامین لکھتے یا قہوہ خانوں میں بحثیں کرتے۔ ان کو کسی پراسرار طریقے سے غیبی امداد ملتی تھی۔

باشندوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے وقت انہیں کبھی احساس تک نہ ہوتا کہ دیہاتی دیہات میں رہتے ہیں شہروں میں نہیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ گاؤں جا کر کسی کی مدد کرتا۔ کسی ناخواندہ کو پڑھاتا۔ کوئی تعمیری کام کرتا۔ اور کچھ نہیں تو اپنے آپ کو ہی معاشرے کا مفید رکن بناتا۔ ان کا خیال تھا کہ سارا قصور

دوسروں کا ہے اور وہ خود فقط تماشائی ہیں اور کسی غلط ملک میں آ پھنسے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ مردوں کی پگڑیاں اور عورتوں کے دوپٹے اُچھالنا تھا۔ ایک اچھالتا دوسرا اٹھا کر چمپت ہو جاتا۔

آمدِ مذہب سے پہلے یہ مذہب کے پرستار تھے لیکن بعد میں دہریے بن گئے۔

تیسرا طبقہ: ان کو فرسودہ اور قدامت پسند گردانا جاتا۔ اتنی لے دے ہوئی مگر ان حضرات نے اپنے نظریے نہیں بدلے۔ ان کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ہمیشہ اُلٹا گنتے تھے۔ مثلاً چار سو قبل از مسیح سے تین سو قبل از مسیح تک۔ یہ چاہتے تھے کہ سب لوگ حضرت آدم اور امّاں حوا کی طرح زندگی بسر کیا کریں۔ ہر نئی چیز سے انہیں نفرت تھی۔ ہر جدید نظریے کے یہ جانی دشمن تھے۔ ان لوگوں کی دھوپ گھڑیاں تک سُست تھیں۔ وہ چلتے ہوئے پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے رہتے اور دوسرے کے کندھے پر کمان رکھ کر تیر چلانا ان کا شغل تھا۔

معاشرتی ترقّی: متعدد شہر کھود کھود کر نکالے گئے۔ آخر ایک مرتبہ ایک عجیب شہر برآمد ہوا جس کے متعلق ماہرینِ آثارِ جدیدہ نے اندازہ لگایا کہ یہ شہر بیسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھے گا۔ کھدائی میں سب سے نمایاں چیز کتابیں اور رسالے تھے۔ اعلیٰ گٹ اپ، شاندار تصویریں، دلآویز سرورق۔ لیکن جب

ماہرین نے ترجمہ شروع کیا تو اس ادب میں نہ جانے کیا ایسی بات تھی کہ جو ترجمہ شروع کرتا اس پر وحشت سوار ہونے لگتی۔ کمرہ بند کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا اور آخر میں یا تو خُودکُشی کر لیتا یا کپڑے پھاڑ کر ویرانوں میں نکل جاتا۔ حکومت نے فوراً شہر پر مٹّی ڈلوا کر اسے دبوا دیا۔ ساتھ ہی احکامات جاری کرا دیئے کہ آئندہ کوئی شخص کوئی شہر کھود کر نہ نکالے۔

اس مضمون کو بھی سراہا گیا۔

چشمی صاحب کے بہرے ہو جانے سے حالات ایک حد تک بدل گئے۔ کُنبے والوں کو کچھ دنوں تشویش رہی لیکن پھر صبر کر لیا گیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ان سے سب کترانے لگے۔ انہیں طرح طرح کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ بہرہ، بے بہرہ، بحر الکاہل۔ چونکہ دوسروں کی گفتگو کا اندازہ انہیں صرف ہونٹوں کی جنبش سے ہو سکتا تھا۔ اس لیے لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر اس طرح ہونٹ ہلاتے کہ آواز بالکل نہ نکلتی۔ بچّوں کو موسیقی کا شوق چرایا۔ ایک طبلہ بجا رہا ہے۔ دوسرا شہنائی، تیسرا ڈھول۔ ساتھ ساتھ چشمی صاحب پر فقرے بھی کسے جا رہے ہیں۔ عزیز و اقارب نظر بچا کر مذاق اُڑاتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں اُن کا ایک دوست بھی نہیں تھا۔ کسی کے دل میں ان کی عزّت

تھی نہ محبّت۔ اُن کی زندگی کے سارے راز لوگوں پر عیاں تھے۔ آج تک جو قابلِ اعتراض حرکتیں انہوں نے کی تھیں ان کا سب کو علم تھا اور جو حرکتیں وہ آئندہ کرنا چاہتے تھے ان کا بھی۔ بیگم چشتی ان کے اندازِ گفتگو اور باتوں کے اُتار چڑھاؤ کی نقلیں اتارتیں۔ انہیں جاہل، سست اور کام چور کہتیں۔ جوانی میں بھی کبھی نہیں مُسکرائے۔ جب دیکھو مُنہ بنا ہوا ہے۔ اور لوگوں پر تنقید ہو رہی ہے۔ دن بھر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔ نہ جانے ابھی کتنی دیر تک یہ عذاب باقی ہے۔

خبروں کا چشتی صاحب کو بے حد شوق تھا۔ پہلے انجم سے فرمائش ہوتی کہ ریڈیو کی خبریں سُن کر کسی کاغذ پر لکھ کر بتا دیا کریں۔ لیکن خبروں کے بارے میں انجم کا نظریہ مختلف تھا۔ اگر کتّا آدمی کو کاٹ لے تو خبر نہیں لیکن اگر آدمی کتّے کو کاٹ کھائے تو خبر ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ ساری خبریں سُن کر وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔

شیطان کی ڈیوٹی لگی۔ وہ خبریں لکھتے ضرور مگر ان میں اصلاح کرتے جاتے۔ ہانگ کانگ سے خبر آئی ہے کہ دس ہزار چینیوں نے سارے چینی کے برتن توڑ ڈالے۔ یوگوسلاویہ کے صدر یوگا کی مشق کر رہے ہیں۔ بقر عید کے موقع پر قربانی کی کھالوں کے لیے اپیل کرتے ہوئے قاضی قدرت اللہ صاحب نے اپنی

پوستین اُتار کر یتیم خانے میں دے دی- یونان سے خبر آئی ہے کہ دو سو باشندے یونانی دواخانوں میں علاج کرانے آرہے ہیں۔

لیکن مقصود گھوڑا نہایت سعادت مند ثابت ہُوا۔ وہ ہر روز چشمی صاحب کے ہاں جاتا۔ ان کے ہاں دیر تک بیٹھا رہتا۔ جب ان کی برائیاں کی جاتیں اور اس کی رائے لی جاتی تو ہو سکتا ہے اور پتہ نہیں کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

مقصود گھوڑا اور انجم اکٹھے دیکھے جانے لگے۔ پھر یکلخت شیطان انجم سے بدگمان ہو گئے۔ مقصود گھوڑے کے رومالوں میں سُرخی لگی ہوئی ملی۔ اور یہ سُرخی لِپ سٹک کی تھی۔ اس کی میز پر ایوننگ اِن پیرس کی شیشیاں نظر آنے لگیں۔ یہ خوشبو شیطان انجم کو دیا کرتے۔ شیطان نے مقصود گھوڑے کو رقیب ضرور بنایا تھا۔ صرف اس لیے کہ جو کچھ ہو سب کے سامنے ہو۔ اس لیے نہیں کہ وہ چھُپ چھُپ کر ایسی حرکتیں شروع کر دے۔ مقصود گھوڑے نے ایک کامریڈ کو ڈبل کراس کیا تھا۔ دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ شیطان نے انجم سے بھی نہایت غیر شاعرانہ باتیں کیں۔ انجم نے کہا کہ مقصود گھوڑا انہیں آزاد شاعری سکھایا کرتا ہے لیکن وہ نہ مانے۔ انجم خفا ہو گئی اور اس نے ان تصویروں کے نیگیٹو مانگے جو شیطان نے اُتاری تھیں۔ شیطان بولے ”نیگیٹو لے لو پوزیٹو بھی لے لو۔ کیمرہ

بھی لا دوں گا۔ شاید اس میں کچھ لگا رہ گیا ہو۔ تم میری زندگی میں یوں آئیں جیسے نخلستان میں چپکے سے اُونٹ آ جائے۔ میں تمھیں رضیہ سے بہتر سمجھتا تھا۔ لیکن اب پتہ چلا کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بالکل ایک سی۔ فرق ہے تو اتنا کہ کچھ شلوار قمیض پہنتی ہیں اور باقی کی ساڑی اور غرارے۔ خیر مجھے افسوس نہیں، کچھ تمھیں تجربہ تو ہو گیا۔ وہ کیا کہا ہے شیکسپئر یا ٹینی سن نے کہ محبّت کر کے بھاگ جانا محبّت نہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ لو یہ شیشی، یہ عطر ایوننگ اِن پیرس سے بدرجہا بہتر ہے۔ اسے آخری تحفہ سمجھو۔ اُن سہانے اور ناقابلِ فراموش لمحوں کی یاد میں جو ہم نے ایک دوسرے سے دور رہ کر گزارے ہیں۔"

آخر مقصود گھوڑے کی زندگی کا سب سے اہم دن طلوع ہوا۔ چند مشہور غیر ملکی سیّاح جو پہاڑوں کی مہم کے سلسلے میں قریب سے گزر رہے تھے مدعو کیے گئے۔ اُن کے ہمراہ غیر ملکی اخباروں کے نامہ نگار بھی تھے۔

اب صرف چند ہی دنوں میں ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک نوجوان نے بے حد قدیم شہر دریافت کیا ہے۔ ایم.جی اپسی کا نام بچّے بچّے کی زبان پر ہو گا۔ بین الاقوامی شہرت مقصود گھوڑے کا انتظار کر رہی تھی۔

سیّاحوں نے کچّی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کو دیکھا۔ تنگ گلیوں کا ملاحظہ کیا۔ اینٹوں کی ساخت، طرزِ تعمیر اور قرب وجوار کا جائزہ لے کر بتایا کہ یہ شہر ایک زرخیز وادی میں آباد تھا اور ایک عظیم شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کی تباہی کی وجہ یا تو زلزلہ ہو سکتی ہے اور یا آتش فشاں پہاڑ کا لاوا۔ ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے کھدائی شروع ہوئی۔ ایک مٹکا نکلا۔ سیّاحوں نے محدّب شیشے سے اس کا معائنہ کیا اور بولے کہ یہ برتن دو ہزار سال پرانا ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز ہل رہی تھی۔ مٹی نکالی گئی تو ایک عجیب وغریب شے نکلی۔ بلیک اینڈ وائٹ سگرٹوں کا ڈبّہ۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سکندرِ اعظم کے حملے سے پہلے کی ایک زنگ آلود صندوقچی برآمد ہوئی جس میں زنگ آلودہ قفل لگا ہوا تھا۔ قفل سکندرِ اعظم کے حملے سے پہلے کا نہیں تھا کیونکہ اس پر میڈ ان جاپان لکھا ہُوا تھا۔

اگلے روز ایک نامہ نگار نے (جو مقصود گھوڑے کا وفادار دوست تھا) اخبار میں غیر مُلکی سیّاحوں کے اس رویّے کی مذمّت کرتے ہوئے لکھا کہ ان کا فرض تھا کہ مزید تحقیقات کرتے۔ ممکن ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی اس قسم کے سگریٹ ہوتے ہوں۔ شاید جاپان اُن دنوں بھی تجارتی ملک ہو۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے شیطان کو کباڑی بازار میں اکثر دیکھا جاتا تھا اور انہوں نے مقصود گھوڑے کے مالی سے بہت سے پرانے برتن بھی خریدے تھے۔ شیطان نے ہمیں بتایا کہ ایسے قدیم شہر تو وہ ایشیا بھر میں جگہ جگہ دریافت کر سکتے ہیں۔

"ہماری موجودہ زمانے کی آبادیوں سے برتن، گھڑے اور روزمرّہ کے استعمال کی کچھ چیزیں لے کر زمین میں دبا دو اور پھر کھود کھود کر نکالتے جاؤ۔ دوسرے ملک کے لوگ فوراً انہیں نوادرات میں شامل کر لیں گے۔ ویسے اجنبیوں کے لیے تو مشرق کا بسا بسایا شہر بھی آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتا ہے۔"

پھر عجب تماشا ہوا۔ چشمی صاحب کو کسی نے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھ لیا۔ گَت پر اُن کا سر مٹک رہا تھا۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ جب تقریر شروع ہوئی تو انہوں نے فوراً اسٹیشن بدل دیا اور فلمی ریکارڈ سُننے لگے۔ اس خبر سے گھر بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ اگلے روز بیگم چشمی نے جان بوجھ کر چشمی صاحب کے پیچھے جا کر چاء کی ٹرے پٹخ دی تو وہ اُچھل پڑے اور سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کا عارضی بہرا پن کبھی کا دُور ہو چکا تھا۔ انہوں نے ساری باتیں بھی سُن لی تھیں۔

ہم شام کو اُن کے ہاں گئے تو وہ کُنبے سمیت چاء پی رہے تھے۔ خاموشی طاری تھی۔ معلوم ہُوا وہ اپنا وصیت نامہ دوبارہ ایڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم نے اس سارے عمل پر نوحہ کہا اور چشتی صاحب کے لیے درازی عُمر کی دُعا مانگی۔ لیکن انہوں نے بات کاٹ کر کہا کہ ایسی بد دعائیں انہیں نہیں چاہئیں۔ اب ان کی آنکھیں کھُل چکی ہیں اور سب کچھ روشن ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی عینک بھی اُتار کر پھینک دی ہے۔ اب وہ قدرتی نظاروں میں دلچسپی لیا کریں گے۔ صبح صبح آج پہلی مرتبہ انہوں نے طلوعِ آفتاب دیکھا۔ اس قدر مسرّت ہوئی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ عنقریب وہ سب کچھ تج دیں گے۔

"میں اس ماحول اور ان لوگوں میں ہرگز نہیں رہنا چاہتا۔ میں حج کرنے چلا جاؤں گا۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ حج میں تو ابھی کافی دن ہیں۔

"اگر دن ہیں تب بھی چلا جاؤں گا۔ کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مقصود گھوڑے سے بہت خوش ہیں۔ (غالباً تکیہ کلام کے سلسلے میں)۔ رخصت ہوتے وقت خالد اُن سے دیر تک مصافحہ کرتے رہے۔ ان کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دباتے رہے۔ ہم نے اس خاص رویّے کی وجہ

پوچھی۔ خالد بولے ”میں نے ہاتھ دبایا تو بہت زور سے تھا لیکن کمبخت انگوٹھی اُتری ہی نہیں۔“

اگلے روز ڈاک گاڑی پر لوگ ہار لے کر پہنچے۔ معلوم ہُوا چشتی صاحب اس سے پہلی پسنجر ٹرین سے جاچکے تھے۔

دفعتہً مقصود گھوڑے کو دورہ سا اُٹھا۔ اور ایک سونے کی انگوٹھی خرید لایا۔ شام کو جب انجم کے کالج سے آنے کا وقت ہوا تو نکّڑ پر انتظار کرنے لگا۔ کچھ بھی ہو اب انگوٹھی انجم کی انگلی میں ہو گی۔ چشتی صاحب کی یہ آخری خواہش تھی۔ عین جب انجم کی سائیکل کے آنے کا وقت ہوا تو کہیں سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصور گھوڑا درختوں سے میدان کی طرف بھاگا۔ کتنی ہی دیر موٹر سائیکل آس پاس کہیں چکّر لگاتی رہی اور مقصود گھوڑا بڑے انہماک سے اس کی آواز سُنتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو دیر ہو چکی تھی۔ اب انجم کے گھر جانا بے سود تھا۔ اگلے روز پھر قسمت آزمائی کے لیے تیار ہوا تو ایک تار منتظر ملا۔ تار میں ماموں کی آمد کی خبر تھی۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ فوراً تجوریاں کھول کر دیکھی جائیں۔ اگر کچھ مل گیا تو کوئی غلط سلط خبر اُڑادی جائے گی۔ خالد نے خاص غیر مُلکی نسخوں

سے قفل کھولے۔ یکے بعد دیگرے ساری تجوریاں دیکھی گئیں۔ سب میں کارتوس رکھے تھے۔ ہر قسم اور ہر سائز کے کارتوس۔

اگلی صبح ماموں جان تشریف لے آئے۔ شام کو مقصود گھوڑا ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا اپنے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ اس کی تنہائی اور اس کے رومان انگیز خیالات سب منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ وہ انگوٹھی بھی جوہری کے ہاں منتقل ہو چکی تھی۔

شیطان کے کمرے میں ہم سب رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ خالد کہہ رہے تھے "آپ لوگوں کی زندگی میں میری وجہ سے جو خوشگوار یا دوسری تبدیلیاں آئیں یا جو بھی آئیں گی ان کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں کیونکہ میں اب ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ میں اب بزنس کرنے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ توڑے دار بندوق کا دیر میں چلنا محض اتفاق نہیں تھا! ہو سکتا ہے کہ مقصود گھوڑے کے ماموں کو کسی نے بہانہ کر کے باہر بھیج دیا ہو۔ اور پھر قصداً واپس بُلا لیا ہو۔ ممکن ہے کہ مقصود گھوڑے کے رومالوں کی سُرخی پان کی سُرخی ہو۔ کیونکہ انجم کی لپ سٹک تقریباً سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ شاید وہ عطر کی شیشیاں خود مقصود گھوڑے نے خریدی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ عین وقت پر جو

موٹر سائیکل آئی اس پر کوئی دانش مند بیٹھا تھا۔ سب کچھ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ بہر حال اب میں بزنس مین کہلاؤں گا۔ اب میرے سامنے ایک شاندار زندگی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اگر آپ کو سیکنڈ کے ڈبّے میں شرعی کوٹ اور تہمد نما پتلون پہنے کوئی ایسا شخص نظر آئے جن کی شکل مجھ سے ملتی ہو جو سگریٹ کو حُقّے کے انداز میں پکڑ کر کش لگاتا ہو اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا ہو، چاء کو طشتری میں ڈال کر شوں شڑپ کر کے پیتا ہو، بعد میں ڈکار لیتا ہو تو اس سے ضرور ملئے۔ شاید وہ میں ہی ہوں گا۔ اگر میں ہوا تو میری شادی بھی ہو چکی ہو گی۔ میں آپ کو زبردستی اپنے گھر لے جاؤں گا۔ مُرغیوں کے شور اور بکریوں کی مَیں مَیں سے واضح ہو گا کہ میں سیٹل ہو چکا ہوں۔ آپ ایک فربہ خاتون سے بھی ملیں گے جو کسی زمانے میں اپنے کالج کی حسین ترین چھریری لڑکی تھیں، فلاسفی، انگلش یا کسی اور مضمون کی ایم اے تھیں۔ ہم آپ کو بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں گے۔ اپنے رشتہ داروں کی ذرا ذرا سی شکایتیں، مقامی سیاست، مارکیٹ کا اُتار چڑھاؤ، الیکشنوں کے قصّے، اپنے بچّوں کے حالات، یہ بچّہ بیمار تھا۔ یہ بچّہ دانت نکال رہا ہے۔ اسے نیلا تھوتھا، عرق گاؤزبان میں ملا کر پلاتے ہیں۔ ہم غروبِ آفتاب کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے رہیں گے۔ چاند نکلا تو سردی کے خیال سے اندر چلے جائیں گے۔ ریڈیو لگایا تو میاں کی ملہار پر بازار کے بھاؤ کو ترجیح دیں

گے۔ اگر آپ نے ہماری زندگی پر رشک یا ترس کھایا تو آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ اسی زندگی کے لیے میں جی رہا ہوں، آپ جی رہے ہیں، ہم سب جی رہے ہیں۔ فقط مجھے رُوفی کے اس مقالے اور ڈگری کا انتظار رہے گا۔ رُوفی تم اسے چشمی صاحب کی زبانی لکھنا۔"

شیطان نے اُٹھ کر چکنے ہاتھوں سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ "چالیس صفحے کا یہ شاندار مقالہ "ٹیکسلا سے پہلے" میں نے بڑی محنت سے چشمی صاحب کی زبانی ہی لکھا تھا۔ اسے ڈگری کے لیے بھیجوں گا ضرور۔ اور بھیجوں گا بھی بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے۔"

"لیکن وہ اس کا عنوان۔۔۔ ٹیکسلا سے پہلے۔"

"اب اس کا عنوان 'ٹیکسلا کے بعد' ہو گا۔"

زنانہ اُردُو خط و کتابت

شوہر کو

سر تاجِ من سلامت

کورنشات بجالا کر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ یہ پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے از حد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلّق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ وہی معمولی کھانا۔ البتّہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دُودھ، کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال کردہ سوہن حلوہ۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا رہا تو

خراب ہو جائے گا۔ سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ کہیں باتوں میں یاد نہ رہے۔ آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل اُن سے ملی تھی۔ شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا۔ یہ غفور دن بدن سُست ہوتا جارہا ہے۔ عُمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہونے لگی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لیے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں۔ گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا کہ تین دن سے کار مرمّت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں۔ ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں۔ یہ کار بھی جواب دیتی جارہی ہے۔ آپ کے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگا لیں۔ خیر تانگہ منگایا۔ راستے میں ایک جلوس ملا۔ بڑا غُل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جا رہی ہے۔ برات نہایت شاندار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینت بُوا مل گئیں۔ یہ ہماری دُور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کے سُسرال میں جو ٹھیکیدار صاحب ہیں نا اُن کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ ہمیشہ زینت بُوا اور رحمت بُوا کو ملا دیتے ہیں۔ رحمت بُوا میری ننھیال سے ہیں اور ماموں عابد کے ہم زلف کے تائے کی نواسی ہیں۔ رحمت بُوا بھی ملی تھیں۔ میں

نے ان سے کہا کہ بھی باجی قدسیہ کو ساتھ لا کر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں۔ تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی مُنہ بولی بہن تھیں بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ کو اپنے عزیز و اقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آج کل زمانہ ایسا آگیا ہے کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں۔ میں نے زینت بُوا کو گھر آنے کے لیے کہا۔ وہ اسی شام آئیں۔ میں نے بڑی خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپوں میں سے دو سو انہیں ادھار دے دیئے۔

ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ بہت بدل چکی ہیں۔ جوانی میں مسز فرید کہلاتی تھی اب تو بالکل رہ گئی ہیں۔ ایک تو بے چاری پہلے ہی اکہرے بدن کی ہیں اس پر طرح طرح کی فکر۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھتی ہیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اور اس سے اگلی جمعرات کو نور چشمی بتول سلمہا کی رخصت ہو گی ضرور آنا۔

میں نے حامی بھر لی اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ چٹاخ باتیں نہیں کرتیں۔ آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انہیں

تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی۔ عُمر کا بھی تقاضا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہو گا۔ ویسے تو ان سردیوں کے لیے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ، نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں۔ وہاں ہم سب بیٹھ کر نِٹنگ کرتی ہیں۔ واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نِٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اس لیے کہ کسی کام میں لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شعر و شاعری اور اُلٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں۔ ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچّوں والے گھر میں خط جا رہا ہے۔ اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ ایسی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں۔ شادی کو پورے سات برس گزر چکے ہیں۔ خُدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے۔ توبہ توبہ۔ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا۔ آپ سُن کر خوش ہوں گے کہ میں پاس ہو گئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بنّو کے لڑکے کو بخار چڑھا۔ یوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھو اور بھون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی پیچھے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رُک گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہو گئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے۔ اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے ۔ یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لیے تھوڑا ہی ہیں۔ اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں، کافی پسند آئیں۔ ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ لمبے لمبے بال، کھوئی ہوئی نگاہیں، کھلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت۔ آپ بہت یاد آئے۔ شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی۔ کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے۔ ہر وقت

کھوئی ہوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے۔ کھلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کم بخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت۔ لیکن خواب کب پورے ہوئے ہیں۔

ان فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ ان میں عورتوں کی قوّالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے اسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بیحد معمولی ہیں۔ مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے جس میں راجہ جی، مورے راجہ یا ہو راجہ آتا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان ڈال دیتے ہیں۔

ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینت بُوا نے شُبہ ساڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سیکرٹری یا سٹینو وغیرہ آ گئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل و صورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہو گی؟ اس کے متعلق مفصّل طور پر لکھئے۔ اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خیریت ہے اور کیا لکھوں، بس بچّے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اصغر پوچھتا ہے کہ ابّا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق

کچھ نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آ چکی ہے۔ میری مانیے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے۔ بھاڑ میں جائے یہ ترقّی اور ایسا مستقبل۔ تھوڑی سی اور ترقّی دے کر محکمے والے کہیں آپ کو اور دُور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بُرا ہو پردیس کا۔ صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امّی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑ رہا ہے۔ مالی کام نہیں کرتا۔ اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیں۔ بچّوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کی فراک، دو چمڑے کے صندوق، زینب بُوا کے لیے اچھا سا تحفہ بلّی کے گلے میں باندھنے کے لیے ربن اور کتّے کا خوبصورت سا کالر، کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سویٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی۔ چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے۔ میں نے منع کر دیا کیونکہ کل تعویذ آ جائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں کہ پھوپھی جان کی بھینس اللہ کو پیاری ہوئی۔ سب کو بڑا افسوس ہُوا۔ اچھی بھلی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہی دم توڑ دیا۔ میں پُرسہ دینے گئی تھی۔ تایا عظیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے۔ احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا، وہ بینک فیل ہو گیا ہے۔ اور ہاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں لکھوں گی۔

سر تاج کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی۔ منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے۔ اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے۔)

امّی جان کے نام

مری پیاری امّی مری جان امّی!

بعد ادائے آداب کے عوض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ والا نامہ آپ کا صادر ہوا۔ دل کو از حد خوشی ہوئی۔ چچا جان کے خُسر صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سُن کر دل کو از حد قلق ہُوا۔

جب سے یہ خبر سُنی ہے چچی جان دھاروں رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی یہ سُناؤنی لے کر پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اگر ذرا سی الکسی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھُڑی تھُڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانے میں پہنچی۔ اس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھا۔ لیکن سالن قدرے تیز آنچ پر پک گئے۔ چنانچہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی۔ بہت خوش ہوئے۔ تائی صاحبہ نے خوان بچھوا کر حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے روز ناشتے پر بھی بُلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کے بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں، رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہیں۔

الفت بیا آئی تھیں۔ تائی صاحب کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں فقط وہ سُنتی نہیں ہیں۔ کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

گو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق ہم سب ممانی جان سے ملنے گئے۔ وہاں پہنچے تو سارا کُنبہ کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے۔

ایک نیا جانور آیا ہے۔ زیبرا کہلاتا ہے۔ بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ دیکھ لیا ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سُننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مِس سیّد آئی تھیں جنہیں حال میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں۔ بڑی قابل عورت ہیں۔ اُنھوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پر لیکچر دیا۔ ہال میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مِس سیّد نے شنائل کا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ قمیص پر کلیوں کے سادہ نقش اچھّے لگ رہے تھے۔ گلے میں گہرا سُرخ پھول نہایت خوبصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا۔ بیضوی بوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی اور چوتھی قطار میں دو پھول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی۔ دوپٹے کا پلّو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سیّد نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے۔ تراشیدہ بال بڑی اُستادی سے پرم کیے ہوئے تھے۔ جب آئیں تو کوٹی کی خوشبو سے سب کچھ معطّر ہو گیا لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہیں آئی۔ ایک آنکھ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے۔ مُسکراتی ہیں تو دانت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بنتی بہت ہیں۔ ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں۔ ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم پانچ سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہُوا۔

آپ یہ سُن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امورِ خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصّہ آتا تھا جب لوگوں کو یہ کہتے سُنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

لذیذ آرنج سکواش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو، یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے کسی اور چیز کی تو نہیں ورنہ نتائج خاطر خواہ بر آمد نہ ہوں گے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہیے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعد ازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو۔ مرکّب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلائیں۔ نہایت روح افزا آرنج سکواش تیار ہو گا۔

(موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن برف کو صابن سے دھلوا لینا نہایت ضروری ہے)۔

انڈا اُبالنا

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈہ لو (بہتر ہو گا کہ انڈہ مرغی کا ہو) پیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ انڈہ خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرّب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے ذرا سا توڑ کر تسلّی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولہے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتی رہو کہ اُبال آنا شروع ہُوا ہے یا نہیں۔ شوں شوں کی آواز پر آگ بجھا دو اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا بالکل تیار ہے اور کھایا جا سکتا ہے۔

مزیدار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یکلخت آ جانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ۔ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دھلوا لینا چاہیے ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکن کھولنا شروع کرو اور خیال رکھو

کہ کہیں انگلی نہ کٹنے پائے۔ بہتر ہو گا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دے دو۔ اب پھلوں کو ڈبّے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزیدار اور مفرح فروٹ سلاد تیار ہے۔ نوشِ جان کیجیے۔

میز پوش سینا

جس میز کے لیے پوش درکار ہوں اس کا ناپ لو۔ بہتر ہو گا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی چوڑائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلنے والی سلائی کی مشین منگاؤ۔ سوئی میں دھاگا پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کرو اور سیتی چلی جاؤ حتیٰ کہ وہی کونا آجائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میز پوش کو استعمال کے لیے تیار سمجھو۔ اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دُگنا پائیدار میز پوش تیار ہو گا۔ ضرورت کے مطابق بعد میں کسی سے بیل بوٹے کڑھوائے جا سکتے ہیں۔

اِستری پھیرنا

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ۔ اِستری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہو گئی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو

جائے تو سمجھ لو کہ اِستری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا بھورا ہونا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ مکمل اِستری ہو گئی۔ دوسرا کپڑا پہلے اِستری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو اِستری کرنا یکلخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چُن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنہیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کیے گئے ہیں ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے۔ کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو اگر پٹرول کی بُو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے۔ اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انہیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا اچھی امّی جان! آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اُٹھتی ہوں۔ آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زور سے بجتا ہے کہ رات کو اُسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے مٹاپے کا طعنہ دیا تھا۔ اس کے لیے بڑی کوشش کر رہی ہوں۔ فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں۔ نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں۔ کپڑوں تک میں سٹارچ نہیں لگنے دیتی۔ ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی۔ آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ورنہ لونڈی کِس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچی تھی۔ پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں نجمہ اور میں۔ شاید یہ اطلاع میری سہیلیوں میں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہے۔

اب خط ختم کرتی ہوں۔ میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب۔ بچّوں کو بہت بہت پیار۔ ہم عمروں کو سلام علیک۔

دیکھئے وہ کون سا مبارک دن ہوتا ہے کہ میں اپنی امّی کو جھک کر آداب کروں اور امّی جان مجھے کلیجے سے لگالیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین۔ فقط

ناچیز، آپ کی بیٹی

منگیتر کو

جناب بھائی صاحب!

آپ کا خط ملا، میں آپ کو ہر گز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ وہم و گمان میں کبھی نہ آسکتا تھا کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

اُمّید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں۔ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں۔ کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ چکی ہے۔ ثریّا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں۔ ہمیں یہ ہوا نہیں لگی۔ نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے۔ ہمارے

ہاں جہاں مذہب شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیال بھی ہے۔

میں بی اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہو گا۔ اوّل تو میں ہمیشہ کالج کار میں جاتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں اُلٹا کرتی۔ ہمیشہ برقع میرے ہاتھوں میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعے کا شوق ہے۔ ابّا جان کی لائبریری میں فرائیڈ، مارکس، ایڈگر ویلیس، ڈکنز، آگاتھا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکّروں کی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے سائیکالوجی پڑھنی شروع کی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہوا جیسے یہ سب درست ہے۔ سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یونہی ہونا چاہیے تھا۔ آخر میں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا

تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک بھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں۔ چنانچہ آج کل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد، مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنّفین ہیں۔ شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ بہت پسند ہیں۔ انہوں نے صرف دو ناول لکھے ہیں جن میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقّی پسند نہیں ہیں۔ اُن کے افسانے، ان کی امنگیں، ان کی دنیا، سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں۔ ان کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا ذرا ان سے پوچھیئے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں۔ جن کے بال گھنگھریالے ہیں اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تِل ہے۔ گاتے اچھا ہیں۔ روٹھتے بہت جلد ہیں۔ جی نہیں، میں انہیں نہیں جانتا۔ نہ کبھی ان سے ملی ہوں۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا تو پھر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھے جایئے اور ملازمت کی کوشش کیجئے کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے۔ اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل۔ یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سیکرٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانہ جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقع ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا ازحد شوق ہے۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے۔ جی ہاں مجھے تھوڑا بہت شوق ہے۔ جے جے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں۔ آپ کو تعجّب ہو گا کہ جب دِلّی سے بٹھنڈہ آتے وقت میں نے جے جے ونتی اسٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپ کی

مراد غالباً خاوند کی ملہار ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سُنی۔ ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں۔ شاید یہ ملہار اُن کی ہو۔ آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے لیکن میں نے لوگوں کو صبح وشام ہر وقت ڈوڈی بچّہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سُنا ہے۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ جوگ اور بِہاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو وہ "جاگ سوزِ عشق جاگ) جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہے۔ مصوّری، بُت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشئے کی بہت سی کتابیں ابّا جان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی۔ ریڈیو پر اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سُنتی ہوں خصوصاً دوپہر کے کھانے پر سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اسحاق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ کے لیے۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے لیکن ان کی کوٹھی

ہم سے ایک میل دُور تھی، پہاڑ کے دوسری طرف لطیف بھائی اور علیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے عفت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رحیم بھائی یونہی اسٹیشن پر مل گئے تھے۔ میں چھٹیوں پر گھر آ رہی تھی انہیں کوئی کام تھا۔ وہ اپنے ڈبّے میں بیٹھے رہے۔ میں اپنے ڈبے میں۔ آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ شکایت تو اُلٹی مجھے اُن سے ہونی چاہیے۔ انہوں نے رِنّی کو وہ بات بتا دی جو میں نے انہیں بتائی تھی کہ اُسے نہ بتانا۔ خیر بتانے میں تو اتنا حرج نہ تھا لیکن میں نے ان سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے اُن سے کہا تھا کہ اس سے نہ کہنا۔

پتہ نہیں یہ کزن والی کون سی بات ہے جس پر انہوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رِنّی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں۔ ویسے میری عادت نہیں کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے میں مُنہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجئے اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجئے تاکہ یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے۔

باقی سب خیریت ہے۔ فقط

آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجئے۔ تاکیداً عرض ہے)

سہیلی کو

پیاری سہیلی بہنیلی

اُوئی دل پتھر کر لیا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ کبھی خیر سلّا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو۔ وہی معاملہ ہوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ۔

شاید تمہیں پتہ نہیں کہ میں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بُوا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا۔ لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں میرا تو جی ہفتے میں اُچاٹ ہو گیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں یا زیوروں کی دُکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سِلوا سکی۔ اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ مل سکا۔ اب سردیوں میں وہی پچھلے سال بنوایا ہوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سِلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروئن کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی۔ کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں۔ وہ جو رشید ہے نا اب تم مجھے چھیڑو گی۔ اے ہٹو۔ پہلے سُن بھی لو۔ اس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں۔ ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی حالانکہ میں نے اِتّی سی بھی لفٹ نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں)۔ پروفیسر کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لیے تو کیا ہوا۔ کُل تین یا چار مرتبہ ان کے ساتھ چاء پی وہ بھی اُن کے بُلانے پر۔ عید پر انہوں نے چھوٹے موٹے تحفے دیئے جو ان کا دل رکھنے کے لیے قبول کرنے پڑے۔ ایک دفعہ اُن کے ساتھ پکچر دیکھی۔ بس کیا تھا شاعری پر اُتر آئے۔ کہنے لگے کہ تم اب تک کہاں تھیں۔ میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ میں حالانکہ ان کی زندگی کے شروع حصّے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل صورت معمولی ہے۔ گنجے بھی ہیں۔ کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں شمار ہوں گے۔ تعجّب ہے کہ اس عمر میں بھلا کون کیا وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے اُن کی خبر لی۔ انہیں جھوٹا ہٹ دھرم، مکّار اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی، فٹ بال کے ریفری بھی رہے ہیں اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھٹ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالکل بلا سوچے سمجھے جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سینما گئی۔ وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھی کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا اور مجھ سے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اس حرکت پر مجھے سخت غصّہ آیا۔ انہوں نے نہ صرف میرے مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا بلکہ ایسی اچھی شام برباد کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے۔ کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا۔ بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجب اُلٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ خیر دونوں جائیں بھاڑ میں۔ سُنا ہے رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کا چچا سلّی کے پیچھے۔

زیبو تو تمہاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں جب اس کے متعلق کوئی چھوٹی سی افواہ تک نہیں اُڑتی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پر اِتراتی ہے۔ اُجڑ اُجڑا حلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لیے دوبار دیکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کسی سیکنڈ لیفٹیننٹ کے ساتھ سکینڈل رہا۔ بار بار اِسے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی ملتا ہے۔ پہلا لیفٹیننٹ بھاگ جاتا ہو گا۔ کیا بتاؤں ان دنوں اِتّی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی۔ میں نے نئے بُندے اور نیا ہار پہن رکھا تھا۔ جھوٹے مُنہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اِدھر میں کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کر چکی ہوں۔ ملمّع کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار بجاتی تھی۔ ایسی اِکل کھری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سُنا ہے کہ رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے۔ ضرور خوابوں میں ڈرتا ہو گا۔

سلّی غریب بائیس برس کی ہو چکی ہے اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا کہ گزٹ پڑھا کرو۔ آج کل ترقّی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے کئی مِل جائیں گے۔

سُنا ہے کہ اس کے لیے سچ مُچ ایک رشتہ آیا تھا۔ کسی بڑے زمیندار کا۔ جس کے پاس دو درجن گائے بھینسیں تھیں اور جو وہسکی میں دُودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

ان صاحبزادی کو بھی پَر لگ رہے ہیں۔ کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں کیا اب کتر کتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں تو سُرخی اس لیے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو کہتی ہیں کہ مو ادل کیا ہے۔ برف کا تودہ ہے۔ اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے۔ مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصّہ ہے تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سُناتے رہے۔ ابّا جان سے کچھ بھی نہیں کہا جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے ہیں تو کیا ہوا۔ مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے رہو تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں۔ خیر دفع کرو جس سب کو۔

بلّو کی منگنی ہونے والی ہے۔ میں نے چھیڑا کہ بلّو کا منگیتر پبلشر ہے اس لئے انگوٹھی پر 'جملہ حقوق محفوظ ہیں' ضرور لکھوائیں عفّو کی بات پکّی ہو گئی ہے۔ نہیں اُس نے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ لیکن سُنو گی تو خوش ہو گی کہ کئی ہزار روپے

ماہوار پاتا ہے۔ اکلوتا ہے۔ بہن بھائی کے قضیے سے پاک ہے۔ عفّو کے والدین نے اچھی طرح یقین کر لیا ہے کہ سگریٹ اور شراب نہیں پیتا، اور کیا چاہیے؟ اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ عفّو نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ اُن کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سناؤ کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمہاری خاموشی سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے دُور ہو تو کیا تِل تِل رتّی رتّی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں۔ خدا سہیلی دے تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

بلّو تو تمہیں یاد ہو گی۔ اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے۔ سُنا ہے کہ لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو۔ خاموشی سے سب کچھ ہو جائے۔ توبہ کیسا ہونّق لڑکا ہو گا۔ شادی ہو رہی یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ ولایت سے ابھی ابھی آیا ہے اس لیے دماغ درست نہیں ہے۔ لیکن کون سُنتا ہے۔ رسمیں ساری ہوئیں۔ مانجھے بٹھانا، گنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پِسوانا، پانی بھروانا۔ تمہیں خوشی ہو گی کہ مہر تین لاکھ مقرر ہوا ہے اور ڈیڑھ ہزار روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے۔ بلّو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی کی رسمیں بھی ادا کی

گئیں۔ چوتھی کھیلنا، دلہن کی جوتی دولہا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولہا کے سر پر بہنوں کا تیل ڈالنا، دولہا کو زعفران کے بہانے مرچیں کھلا دینا، دولہا کے جوتے چُرا لینا، پھر دولہا کو اُلٹی چارپائی سے گرا دینا، اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا۔ میراثنوں کا بیہودہ گانے گانا، بڑا لطف رہا۔ دولہا بھی ایک چغد نِکلا۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ۔ سُنا ہے کہ نکاح کے فوراً بعد کہیں فرار ہو گیا۔ بڑی مُشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہو گئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کی نشانیاں ہیں۔ دولہا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں یہ اپنے پاس رکھئے اور تین لاکھ کی رقم کو کم کر کے مہر کو اور کچھ نہیں تو دو لاکھ اسی ہزار ہی کر دیجئے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی آئے ہوئے تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے۔ جب ڈانٹا تو بولے کہ اتنا سنگھار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیور ایک دوسری کو دکھانے کے لیے پہنتی ہیں۔ موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

بلّو کی رخصت ہو گئی۔ خدا کرے کہ بنےّ بنّی میں ہمیشہ بنی رہے لیکن آثار اچھّے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں، پَر کا کوّا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں۔ پر بہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سُنا کہ رنڈوے ہیں مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہے۔ خیر مجھے کیا۔

اوئی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ لو اب تو خوش رہو یا اب بھی رُوٹھی رہو گی۔ اب خط لکھو۔ مفصّل سا ہو۔ کِس کِس کی نسبت ٹوٹی ہے؟ کِس کِس کے گھر شکر رنجی ہوئی ہے؟ یا ہونے کا امکان ہے؟ ہمارے جاننے والیوں میں سے کوئی سسرال سے لڑ کر آئی ہے؟ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سُنی؟ ان دِنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں؟ کوئی نیا فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن؟ ساری باتیں مفصّل لکھنا۔

اُمید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہو گی۔ کبھی آ کر مل ہی جاؤ۔ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط

تمہاری دُور افتادہ سہیلی

برساتی

میں علی الصبح اُٹھا اور سامان باندھنا شروع کر دیا۔ آج میں ایڈنبرا کو چھوڑ کر لندن جا رہا تھا۔ پانچ سو میل موٹر چلانا تھی۔ کار میں سامان رکھ کر پڑوسیوں سے علیک سلیک کی اور پروفیسر کے ہاں پہنچا۔ وہ ناشتے پر میرا منتظر تھا۔

"ایسے موقعے مجھے اداس کر دیتے ہیں۔" وہ بولا "جوانی میں اپنے بچّوں کو رخصت کیا کرتا تھا اب بڑھاپے میں شاگردوں کو۔ ہم سکاٹ ویسے بھی جذباتی ہیں۔"

اس میز پر ہم نے کتنی مرتبہ لمبی لمبی بحثیں کی تھیں۔ دُنیا کے ہر موضوع پر۔

پروفیسر کہہ رہا تھا۔ "پینسٹھ برس کی زندگی میں کوئی تجربہ ایسا نہیں جو مجھے نہ ہُوا ہو۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مسرّت پہنچائی وہ ہے صبح صبح چاء کی پیالی اور ایک سگریٹ۔۔ اس کے بعد دن بھر جو کچھ ہوتا ہے سب خرافات میں شامل ہے۔ لیکن زندگی کچھ ایسی بُری بھی نہیں۔ ہو سکتا تھا کہ میرے والدین

شادی نہ کرتے اور میرا وجود ہی دنیا میں نہ ہوتا۔ اچھا ہُوا کہ یہ تماشا دیکھ لیا۔ میں زیادہ باتیں تو نہیں کر رہا ہوں؟ یہی وقت ہے جب میں بول سکتا ہوں۔ میری بیوی باہر گئی ہوئی ہے۔" چلتے وقت پروفیسر نے نصیحت کی "حدِ نگاہ بھی محدود نہ رہے۔ ہمیشہ پہاڑیوں کے اس پار دیکھنا۔"

میں نے شہر کا ایک چکر لگایا پھر یونہی خیال آ گیا کہ این سے ملتا چلوں۔ ویسے کل اسے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے ملا وہ بہت خوش ہوئی۔

"میں تمھیں ڈنبار میں اتار دوں گا۔ وہاں سے بس لے لینا۔"

ہم دونوں روانہ ہوئے۔ آبادی سے باہر نکل کر میں نے موٹر روکی اور پیچھے مُڑ کر ایڈنبرا کے خطِ فلکی کو دیکھا۔ نوکدار مینار، مخروطی گنبد، پہاڑیاں جیسے قرونِ وسطیٰ کا کوئی شہر۔

"تم تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پھر کبھی یہاں نہ آؤ گے۔"

"آؤں گا لیکن زندگی کے یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

ہم دونوں خاموش تھے۔ این مجھے سگریٹ سلگا کر دیتی۔ دونوں مُسکراتے پھر اُداسی چھا جاتی۔

سورج نکل آیا تھا۔ سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پر سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں HEATHER کے سُرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔

ڈنبار آ گیا۔

"میں بیرک سے ٹرین میں چلی جاؤں گی۔"

بل کھاتی ہوئی سڑک نشیب و فراز، سبز پہاڑیاں اور سمندر۔

بیرک آ گیا۔

"اچھا بس نیو کاسل تک وہاں میں خود تمہیں ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

سکاٹ لینڈ کی حدود ختم ہو چکی تھیں۔ نیلی جھیلوں اور رنگین پہاڑوں کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ رابرٹ برنز اور اس کے نغمے، اونچے پہاڑوں کی دُھند اور شہنائیوں کی دلسوز دُھنیں سب پیچھے رہ گئے تھے۔

نیو کاسل آیا تو این بھی واپس سکاٹ لینڈ چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت ہم بالکل خاموش تھے۔

"یہ برساتی تم نے نئی لی ہے؟"

میں نے پہنی ہوئی برسائی کو دیکھا۔ واقعی نئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید جون نے بغیر پوچھے اسے ڈرائی کلین کرا دیا۔

ٹرین چلنے لگی۔ این کہہ رہی تھی "اپنی جرابیں مت پھینکنا، مرمّت کے لیے مجھے بھیج دینا۔ کام پر ناشتہ کیے بغیر بھی مت جانا۔ لوگوں سے لڑنا مت۔"

اب میں تیزی سے لندن کی طرف جارہا تھا۔ برساتی کی آستینوں کو دیکھا پھر کالر اور پٹی کو۔۔۔ کیا یہ وہی برساتی ہے؟ ایسی برساتیاں تو جگہ جگہ دکانوں میں ملتی ہیں۔

کچھ دُور جا کر موٹر روک لی۔ سامنے چشمہ بہہ رہا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر غور سے برساتی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کالر پر کسی نے نام لکھا تھا۔ یہاں سُرخ نشان تھے یہاں سبز دھبّہ۔ اس جگہ موم لگا ہوا تھا اور اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ برساتی کہاں گئی جو میری رفیق تھی؟ جس سے طرح طرح کی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ دُھندلی صبح میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جب میں پہلے پہلے ایڈنبرا آیا۔ گاڑی پہنچی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں اسٹیشن کے ہوٹل میں ناشتہ کر رہا تھا۔ بیرے نے پردہ ہٹایا تو کھڑکی میں سے عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ زمین پر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دُھند سے فصیلیں اور برجیاں اُبھر رہی تھیں۔ ایڈنبرا کا قلعہ پریوں کا

محل معلوم ہو رہا تھا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں اوورکوٹ خریدنے لگا۔ یہاں نوعُمر طبقہ برساتی پہنتا ہے اور ادھیڑ عُمر کے لوگ اوورکوٹ۔ بوڑھے برساتی اوورکوٹ اور چھتریاں تینوں استعمال کرتے ہیں۔

ایک سبز رنگ کی برساتی پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ اسے پہنا، پیٹی کو کس کر آئینے میں دیکھا تو خوب چُست نظر آنے لگا۔ فوراً اوورکوٹ کا ارادہ ترک کر دیا اور برساتی خرید لی۔

اور وہ دن جب این سے ملاقات ہوئی۔ اس مغرور لڑکی کو میں نے کئی مرتبہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ ہمیشہ اکیلی ہوتی سب سے الگ تھلگ۔ پاس سے گزرتے وقت ہم دونوں مُنہ پھیر لیتے۔

یونیورسٹی کے ریکٹر کا انتخاب ہو رہا تھا۔ امیدوار کئی تھے لیکن اصلی مقابلہ سر الیگزینڈر فلیمنگ اور آغا خان کے درمیان تھا۔ سب کو یقین تھا کہ آغا خان جیت جائیں گے لیکن بالکل ذرا سے فرق سے فلیمنگ منتخب ہو گئے۔

دوپہر کو ان کا ایڈریس تھا۔ ایڈنبرا کی پرانی رسم ہے کہ ریکٹر کی تقریر کو صرف ایک شخص سُنتا ہے۔ خود ریکٹر۔

بڑے ہال میں خوب ہنگامہ مچا۔ ہم قسم قسم کی چیزیں لے کر پہنچے۔ سیٹیاں، ڈھول، باجے، بطخیں، کبوتر، چھتریاں۔

لیکچر شروع ہوا تو کئی طلباء نے چھتریاں لگا لیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ اس گیلری سے رسّہ پھینکا گیا جسے دوسری طرف باندھا گیا۔ ایک لڑکا اس سے لٹک کر ہال عبور کرنے لگا۔

ڈھول بجے، کبوتر چھوڑ دیئے گئے، باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا اس لیے وہ اندر ہی اُڑتے رہے۔ میں نے ایک بطخ چھوڑی جو سیدھی ایک لڑکی کے سر پر جا بیٹھی۔ اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ یہ این تھی۔

فلیمنگ کہہ رہے تھے ”پنسلین کے پہلے تجربے کتّوں اور بھیڑوں پر کیے گئے۔“

بھوں بھوں بھوں دیر تک ہال میں بھونکنے اور بھین بھین کی آوازیں آتی رہیں۔

میرے سر پر ایک پٹاخا پھٹا، اسے این نے پھینکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے بطخ مانگ کر این کے سر پر رکھ دی۔

فلیمنگ کی آواز آئی ”لوئی پاسچر نے اپنی ساری عمر جراثیم کے پیچھے گزار دی۔“

نعرے لگنے لگے۔ ”سبحان اللہ کیا زندگی تھی کہ جراثیم کے پیچھے گزری۔“

این نے پھر ایک پٹاخا پھینکا۔ میں نے فوراً ایک بطخ اس کے سر پر رکھ دی۔

فلیمنگ نے الکحل کی تعمیر کا ذکر کیا تو جیسے حاضرین کو نشہ چڑھ گیا۔ وہیں لوٹنے لگے۔ ایک صاحب بے ہوش ہو گئے۔ انہیں سٹریچر پر لٹایا گیا۔ دروازے کے پیچھے پہنچے تو چھلانگ مار کر اُٹھے اور واپس آ بیٹھے۔

یہ ہنگامہ ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ پورچ میں این ایک بڑا سا اشتہار پڑھ رہی ہے۔ شام کو نئے ریکٹر کے اعزاز میں رقص ہو رہا تھا۔

”کیا ارادہ ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”ضرور چلوں گی۔“

رات کو ہم رقص پر گئے۔ میرے پروفیسر نے مجھے فلیمنگ سے ملایا۔ پُر شفقت چہرہ، سفید بال، باتوں میں بھولا پن۔۔ یہ وہی عظیم شخص ہے، بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محُسن۔ جتنی جانیں اس نے بچائی ہیں آج تک کسی نے نہیں بچائیں۔

اسکاٹش دُھنوں پر رقص ہوتا رہا۔ آخر میں سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر AULD LANG SYNE گایا۔ باہر نکلے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ این

نے شام کا ہلکا پھلکا سا گاؤن پہن رکھا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ میں نے برساتی اُتار کر اسے پہنا دی۔

آسمان پر نامعلوم سی روشنی تھی اور چاروں طرف سناٹا۔ مخروطی برجیاں اور چمکیلے مینار تاروں کو چھُو رہے تھے۔ مجھے یہ گلیاں بہت مانوس سی معلوم ہوئیں۔ رات کے اندھیرے میں سب بستیاں ایک سی لگتی ہیں۔

پھر یونیورسٹی کے طلباء نے قندیلوں کا جلوس نکالا۔ این اور میں ہزاروں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بڑی بڑی قندیلیں لیے قلعے سے روانہ ہوئے۔ اندھیری رات تھی۔ سڑکیں خالی تھیں۔ نیچے اُترتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔

قندیلوں سے موم پگھل پگھل کر برساتی پر گرتا رہا اور نشان پڑتے رہے۔

مگر اب نہ یہ نشان ہیں نہ دوسرے، سب دُھل چکا ہے۔ اس سے اب وہ خوشبو بھی نہیں آرہی جو این کو پسند تھی۔ اور میں لندن جا رہا ہوں۔ اس شہر کی مشینی زندگی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ پندرہ میل اس طرف نکل جاؤ، دس میل مخالف سمت میں چلے جاؤ لندن ختم ہی نہیں ہوتا۔ جہاں شراب خانوں میں محبوبہ کو سامنے بٹھا کر لوگ فٹ بال، غیر ملکی پالیسی، بزنس، کتّوں اور گھوڑوں کی باتیں

کرتے ہیں۔ کل سے پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ لندن میں دُھواں ہو گا، دُھند ہو گی اور ہر وقت کی بارش۔۔ لیکچروں اور امتحانوں کے چکّر سے مدّتوں نجات نہیں ملے گی۔۔ کل زندگی جامد ہو جائے گی۔ ایک سیّاح چار دیواری میں بند ہو جائے گا۔

اس جمود سے میں پہلے بھی کئی بار آشنا ہوا تھا۔ ایسے گھُٹے گھُٹے سکون سے سب سیّاح آشنا ہوتے ہیں۔ جب قدم بوجھل ہو کر زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ شاہراہوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نظر بندی اب کبھی ختم نہیں ہو گی۔ یہ گھٹا کبھی نہ چھٹے گی۔

میں نے پھر برسائی کو دیکھا۔۔۔ یہ وہ تو نہیں جو ان اجنبی آسمانوں اور اَن جانے خِطّوں میں میری رفیق تھی۔ جس کے قرب میں طرح طرح کے پیغام تھے۔ نئے نئے ملک، چمکتی ہوئی سڑک اور آزادی۔۔۔!

اِس کالر کے نیچے ہسپانوی سینوریتا کے سُرخ ہونٹوں کے نشان تھے۔۔۔

ایک دُھند سی چھا گئی۔ چشمے کا شور دھیما ہوتا گیا۔ دھوپ پھیکی پڑتی گئی۔ وہ سب نقوش ذہن میں اُبھرنے لگے۔ میں اور میرا دوست رودبار انگلستان عبور کر رہے ہیں۔ ہم ہسپانیہ جائیں گے۔ میں اب وہ شرارتی اور بے چین لڑکا تھا جس نے

سکول سے بھاگ کر ایک باغ میں واشنگٹن ارونگ کی کتاب ''الحمراء کی کہانیاں'' پڑھی تھی۔ جسے اندلس نے مسحور کر دیا جس کے خوابوں میں وہ سہانی فضائیں بس گئیں۔

رودبار انگلستان کو عبور کر کے ہم پیرس پہنچتے ہیں۔ فرانسیسی زبان بالکل سمجھ نہیں آتی۔ لیکن یہ الفاظ بار بار سُننے میں آتے ہیں۔۔شُوں داشیں، فوں فاں، ساں سیں۔

رات کے کھانے کا بل آتا ہے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں۔ دو ہزار کچھ سو فرانک!

دو تین ایسے کھانے اور رہے تو ساری سیر یہیں ختم ہے۔ لیکن حساب لگاتے ہیں تو کل ڈھائی پونڈ بنتے ہیں۔ بڑی فرحت ہوتی ہے۔

صبح اُٹھ کر میں ڈائری دیکھتا ہوں، آج کے ضروری کام یہ ہیں:

1۔ حجامت

2۔ کالر کا بٹن

3۔ صابن

4۔ نپولین کا مقبرہ

5۔ رومال

6۔ ورسیلز کے محلّات

چنانچہ سیدھے حجّام کے ہاں پہنچتے ہیں، دکان پر لکھا ہے۔

"یہاں حجامت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے اور انگریزی بولی جاتی ہے۔"

یُوں تو سب حجّام باتونی ہوتے ہیں۔ لیکن فرانسیسی حجّام کی باتیں سُن کر اخبار خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدھ گھنٹے میں صرف وہ ایک کام کی بات کرتا ہے۔ "جرمن بہت بُرے پڑوسی ہیں۔ جب بھی یورپ میں جنگ ہوتی ہے تو اکھاڑے کے لیے ہمارا ملک چُنا جاتا ہے۔ لڑتے دوسرے ہیں لیکن دیکھا دیکھی ہمیں بھی شریک ہونا پڑتا ہے۔ جب جنگ ختم ہوتی ہے تو جیتتا کوئی اور ہے۔۔ آپ کے سر میں مالش کروں؟"

نپولین کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرے سے ملتا جلتا ہے۔ زبردست ہجوم ہے۔ شور مچا ہُوا ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں، اونگھ رہے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، سودا بیچ رہے ہیں۔ لیکن مقبرے سے کسی کو دلچسپی نہیں اور نہ غالباً نپولین سے۔

دوپہر کو دو ہزار ایک سو کچھ فرانک کا لنچ کھا کر ورسیلز کے محلّات دیکھتے ہیں۔ یہ

جگہ ایک بہت بڑا ہوٹل معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں فرانسیسی بادشاہ لوئی یاد آجاتا ہے جو اس عمارت میں ستّر برس رہا۔ آخری دنوں میں کافی سٹھیا گیا تھا۔ ہسپانیہ سے جنگ کا اعلان کرتے وقت اس نے یہیں وہ شیخ چلّیانہ فقرہ کہا تھا "اب ہسپانیہ اور ہمارے درمیان کوئی پیرانیز حائل نہیں رہے۔" تیرہ برس تک لڑائی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرف کے سپاہیوں کی عمروں میں تیرہ برس کا اضافہ ہو گیا اور پیرانیز پہاڑ وہیں رہے جہاں ہمیشہ سے تھے بلکہ آج کل بھی وہیں ہیں۔

پیرس کو غور سے دیکھا تو فرانسیسیوں کی رومان پسندی کے قصّے بے بنیاد معلوم ہوئے۔ یہ لوگ اکثر جوڑوں میں باہر نکلتے ہیں لیکن آپس میں کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے کچھ بیزار سے معلوم ہوتے ہیں۔ بچّوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ یا تو یہ لوگ شادیاں نہیں کرتے یا سخت قسم کے فلاسفر ہیں۔ عورتیں چھوٹے قد کی ہیں۔ چہرے پر میک اپ اس قدر ہوتا ہے کہ بجائے خدوخال کے صرف میک اپ کے فرق سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور۔ وہ سب رنگ رلیاں جنہیں فرانس سے منسوب کیا جاتا ہے، شاید انقلابِ فرانس سے پہلے ہوتی ہوں گی۔ ان دنوں یہ لوگ کسی پیچیدہ مسئلے پر ہر وقت غور کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم پیرس کا مشہور عریاں رقص دیکھنے جا رہے تھے تو مجھے جولیا کا فقرہ بار بار یاد آرہا تھا کہ بھلا ڈاکٹروں کو عُریاں رقص سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جولیا سچ کہتی تھی لیکن ہمیں محض روایتاً جانا پڑا۔ جیسے مشرق سے ہر آنے والے کے متعلق اہلِ یورپ کو یقین ہوتا ہے کہ اگر یہ شخص تاج محل میں باقاعدہ رہا نہیں تو اس نے دیکھا ضرور ہو گا۔ اسی طرح یورپ سے آنے والوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ انہوں نے پیرس کے وہ ناچ ضرور دیکھے ہوں گے۔

سٹیج پر لڑکیوں کو دیکھتے ہی بوڑھے دُور بینیں نکالتے ہیں۔ یہ دُور بینیں کرائے پر ملتی ہیں لیکن صرف مردوں کو۔

پیرس سے روانہ ہوئے۔ جون آف آرک کے گاؤں سے ہوتے ہوئے ٹورز پہنچے۔ دریا کو عبور کر کے اس میدان کو دیکھا جہاں آٹھویں صدی میں ایک فیصلہ کُن جنگ ہوئی تھی۔ عرب فرانس فتح کرتے ہوئے پیرس سے صرف سوا سو میل دور رہ گئے تھے۔ ٹورز کی لڑائی دنیا کی اہم ترین لڑائیوں میں سے تھی۔ عربوں کی شکست نے یورپ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

سان سبستیاں پر ہسپانوی سرحد عبور کر کے سمندر کے کنارے رات بسر کی۔ اگلے دن برگوس کے ایک ہوٹل میں کھانے کا انتظار کر رہے تھے کہ یکلخت

پچاس ساٹھ خواتین و حضرات ساتھ آ بیٹھے۔ کسی کی شادی خانہ آبادی ہو رہی تھی۔ ہمیں بھی براتیوں میں شریک کر لیا گیا۔

ہر ہسپانوی آدھا بُل فائٹر ہوتا ہے اور آدھا ڈون کوا کزاٹ۔ فرانسیسی انعام لئے بغیر نہ ٹلے گا لیکن ہسپانوی رقم لے کر مُنہ بنائے گا۔ اسے مٹھائی یا سگریٹ دو تو خوشی سے قبول کرے گا کہ اسے ہم رتبہ سمجھ کر تحفہ دیا گیا ہے۔

راستے میں موٹر کھڑی دیکھ کر ایک بیل گاڑی والا رُک گیا کہ کیا مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھوں اور گندمی رنگت والے ہسپانوی ہمیں اجنبی نہ سمجھتے بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ خود اُن لوگوں نے ہم سے راستہ پوچھا۔

گاؤں میں کھانے کے لیے رُکتے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہمیں زبان نہیں آتی دکاندار ہمیں باورچی خانے میں لے جاتا۔ گوشت مچھلی سبزیاں انڈے۔ ہم اشارہ کرتے اور وہ جلدی سے پکا دیتا۔

سیدھے سادے شریف لوگ۔ غریب مہمان نواز۔ سفیدی کئے ہوئے گھر جو دھوپ میں چمکتے ہیں۔ مکانوں کے دریچے اتنے کشادہ اور سجے ہوئے کہ خواہ مخواہ اندر جھانکنے کو جی چاہتا ہے۔

میڈرڈ کی شاندار سنگِ مرمر کی بنی ہوئی عمارتوں، بڑی بڑی جھیلوں اور وسیع

باغات کو دیکھ کر یہ خیال تک نہیں ہوتا کہ یہاں خانہ جنگی ہوئی تھی۔ مشہور آرٹ گیلری پراڈو میں ہم نے پورا دن صرف کیا۔ ٹشاں، وان ڈیک، ال گریکو، روبنز، رافیل، گویا، ماریلو اور دوسرے فن کاروں کی تصویروں پر ہسپانوی فخر کرتے ہیں اور یہ فخر بجا ہے۔

صبح صبح فرانکو کا مراکشی باڈی گارڈ گلیوں سے گزر رہا تھا۔ خوبصورت وجیہہ شہسوار قدیم عربی یونیفارم۔۔انہوں نے کئی مرتبہ فرانکو کی جان بچائی۔ ملکی خانہ جنگی میں فرانکو کی فتح مراکش کے قبیلوں کی مرہونِ منت تھی۔

ہسپانوی موسیقی کی اداس دُھنیں سُن کر مجھے بدّوؤں کے قافلے یاد آ گئے جنہیں صحراؤں میں دیکھا تھا۔ بدّوؤں کا مقولہ ہے کہ آبادیوں میں صرف بزدل رہتے ہیں۔ بدّو بستیوں میں محض اس لیے آتے ہیں کہ اگلے سفر کی تیاری کر سکیں۔ خیمے کے گرد گھاس اُگنے سے پہلے وہ کُوچ کر جاتے ہیں۔

خانہ بدوشی عربوں کی تاریخ کا اہم جزو رہی ہے۔ نہایت المناک جزو۔

ہوٹل کی چھوٹی سی دکان میں صندلی رنگت اور سیاہ بالوں والی حسینہ نظر آتی۔ خواہ مخواہ اس سے پوچھنے کو جی چاہتا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ اس وقت کیا بجا ہے؟ باہر موسم کیسا ہے؟

میرے دوست نے اس سے آویزے خریدے اور انہیں پہننے کے سلسلے میں ترکیبِ استعمال دریافت کی۔ اس نے مُسکرا کر اپنا ایک آویزہ اُتارا اور یہ نیا آویزہ پہن کر چہرہ ہمارے سامنے کر دیا۔

میرے دوست نے نعرہ لگایا "بونو" (یہ لفظ نیا نیا سیکھا تھا)

اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔ شرما کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ بونو کے یہاں وہی معنے ہیں جو ہمارے ہاں "اف مار ڈالا" کے ہیں۔ لیکن حیرت ہوئی کہ مغربی لڑکیاں شرماتی بھی ہیں۔

اندلس تخیّل سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اندلس کے سحر کو کوئی چیز اتنی اچھی طرح واضح نہیں کرتی جتنا کہ وہاں کا حُسن۔

اُندلسی عورتیں پھولوں سے زیادہ حسین ہیں، ان کی ہر ادا میں عجب شانِ دلرُبائی ہے۔ پُر تمکین، قابلِ ستائش، گہری جھیلوں سے زیادہ گھمبیر خاموش۔ جیسے کوئی راز سدا ان کی پراسرار اور سرکش روح میں پوشیدہ رہتا ہے۔ ایسا بیش بہا بھید جسے عاشق یا خاوند تک نہیں پا سکتے۔ سادگی ایسی کہ ان کی موجودگی میں ان کا قرب تک محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں رواں رواں کسی آتشیں جذبے سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ جب یہ محبّت کرتی ہیں تو محبوب کو اپنی شدید چاہت اور

لااُبالی پن سے متحیّر کر دیتی ہیں۔ لیکن انہیں کبھی دِکھاوے کی محبّت نہیں ہوتی۔

غرناطہ ایک وسیع وادی میں پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑیوں پر الحمراء کا قصر اور جنت العریف کے باغات ہیں۔ ایک طرف کی پہاڑیوں پر پرانا شہر البیرزن آباد ہے جہاں خانہ بدوش رہتے ہیں۔ عقب میں سیر انیوادا کی برفانی چوٹیاں ہیں جہاں سے الحمراء کے فوّاروں کو پانی ملتا ہے۔

اُوپر پہاڑ کی چوٹی سے دور افق پر ایک دھندلی سی چیز نظر آتی ہے۔ افریقہ کا ساحل۔

ان باغوں میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی ہے ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔ یہ نامعلوم سی خوشبو اس کے پیراہن کی ہے۔ کسی نے پھولوں کو چھُولیا تھا۔ یہ ٹہنیاں اب تک ہِل رہی ہیں۔

الحمراء اب بھی پریوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ ہر ستون، ہر محراب، ہر در و دیوار کے خوشنما نقوش چپ چپ سحر زدہ۔ لیکن اس ویرانی میں زندگی کے آثار صرف فوّاروں کی صدائیں ملتے ہیں۔ یہ چشمے کبھی خاموش نہیں ہوئے۔ عربوں کے زمانے سے اب تک رواں ہیں۔ گزرتے ہوئے وقت کے مدّو جزر انسانی زندگی کی کم مائیگی، فلسفہ تعمیر و تخریب سب ان فوّاروں میں جذب ہو کر رہ گئے

ہیں۔

شام کو نیا چاند نکلا۔ میں نے پہاڑی سے نیچے دیکھا۔ ساری وادی میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ برفانی چوٹیوں سے تارے جھانک رہے تھے۔

وہ کیسا منحوس طلسم تھا جو سدا اس قصر پر مسلط رہا۔ یہ قصر جو اب بھی دنیا کی حسین ترین چیزوں میں سے ہے۔ ان سُرخ فصیلوں کے اندر جو ارضی جنّت ہے وہ اس قدر غم انگیز کیوں ہے۔

ہوا کا جھونکا آیا اور خوشبوئیں بکھیرتا چلا گیا۔ خوش الحان پرندوں کے چہچہے سنائی دیئے اور فوّاروں کی صدا۔ دل میں اداسی کی تہیں بیٹھتی چلی گئیں۔ وہ اُداسی جو حُسن سے مربوط ہے۔

سی فورانتونیو ہمارا گائیڈ تھا۔ ایسی نورانی شکل کہ ولی اللہ معلوم ہوتا۔ یورپ میں چالیس پینتالیس برس کی عمر کے بعد اکثر آدمی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا والد، دادا سب گائیڈ تھے۔ اسے فخر تھا کہ اس کا ایک بزرگ واشنگٹن ارونگ کا گائیڈ رہ چکا تھا۔ چنانچہ اس کی تصنیف میں بیشتر روایات اور قصّے انتونیو کے بزرگ کے بتائے ہوئے تھے۔

''لیکن اب یہ نسل ختم ہو جائے گی کیونکہ میں لاولد ہوں۔'' وہ ٹھنڈا سانس بھر

کر کہتا۔

اُسے موسیقی، ادب اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ ”سامنے دیواروں پر عجیب سے خطوط بنے ہوئے ہیں۔ عرب یہاں ٹرگنامیٹری پڑھاتے تھے۔ قصر کے بڑے دروازے باب العدل پر جو کنجی کی شبیہ ہے، یہ صوفیوں کا نشان ہے وہ کنجی جسے خدا دِلوں کے قُفل کھولتا ہے۔ ”ہسپانوی باغوں میں ایک رات“ کی مشہور دُھن دراصل الحمراء کے چشموں کی صدا کا تاثر ہے۔ اندلس سے پسپا ہوتے وقت فرانسیسی الحمراء کو بارود سے اُڑانے لگے تھے لیکن وقت پر پتہ چل گیا۔ تب سے ہمیں ان سے نفرت ہے۔ آپ بالکل ہسپانوی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اپنے ملک میں کبھی کچھ کر بیٹھیں اور وہاں سے بھاگنا پڑے تو چھپنے کے لیے سیدھے یہاں چلے آیئے۔ کسی کو پتہ تک نہ چلے گا۔“

وطن کی بہت سی باتیں یہاں ہیں۔ کسی سے کچھ پوچھو تو چار پانچ آدمی ویسے ہی ساتھ آن کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو لوگ خوشبو لگا کر گلیوں میں بغیر کسی مقصد کے دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹل کھلے ہوئے ہیں اور ریکارڈ بج رہے ہیں۔ لیکن یہاں ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے ہاں نہیں۔ محبوبہ کے دریچے کے نیچے کھڑے ہو کر گانا گایا جا سکتا ہے (اگرچہ اس کی اجازت

ہماری فلموں میں ہے) لیکن ہسپانوی محبوبہ جواباً ہرگز نہیں گائے گی۔ محبوبہ کے والدین تب تک خاموش رہیں گے جب تک عاشق سنجیدگی سے گاتا رہے، لیکن اگر وہ بات کرنے کی کوشش کرے تو شور مچ جائے گا اور محبوبہ کو اندر بلا لیا جائے گا۔

انتونیو نے خانہ بدوشوں کے ناچ کی بڑی تعریف کی۔ "اگر آپ نے غاروں میں خانہ بدوشوں کا یہ رقص نہیں دیکھا تو اندلس نہیں دیکھا۔"۔

یہ رقص خاص فرمائشی چیز ہے اور پبلک کے لیے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کم از کم پانچ سو پیسٹے (تقریباً چھ پاؤنڈ) دینے پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کو شراب بھی پلانی پڑتی ہے لیکن تین پاؤنڈ اور گویا مجرا کرنا ہے۔

شام کو ہم البیرزن گئے۔ سیڑھیاں طے کر کے غاروں میں اُترے۔ مدھم سی روشنی میں سگریٹ کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو آ رہی تھی۔

شراب کا دَور شروع ہوا۔ گٹار بجنے لگی۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی چنچل لڑکی بار بار مجھ سے اپنی زبان میں سوال پوچھ رہی تھی۔ ایک جام مجھے بھی زبردستی دیا گیا جسے میں نے اس لڑکی کو دے دیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے جام میں انڈیل لیا۔ گھڑی دیکھنے کے بہانے اس نے میری کلائی تھام لی۔

وہ ناچنے اُٹھی تو دوسری آ بیٹھی۔ وہ بھی پریشان کرنے لگی۔ دفعتاً پہلی نے اسے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ موقع پاتے ہی وہ پھر آ بیٹھی۔ اب باقاعدہ چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے انہیں چھڑایا گیا۔ پہلی لڑکی کے رخسار پر لمبا نشان تھا جیسے خنجر کے زخم کا نشان ہو۔

"یہ خانہ بدوش لڑکیاں بڑی تُندخُو ہوتی ہیں" انتونیو نے میرے کان میں کہا "جدھر مائل ہو جائیں تو جان تک لڑا دیتی ہیں۔ ذرا محتاط رہیے۔ یہ پوچھے رہی تھی کہ آپ کہاں مقیم ہیں۔"

"اسے کوئی غلط پتہ بتا دیجئے۔"

اب اصلی رقص شروع ہوا۔ یہ خانہ بدوشوں کا قدیم رقص ہے۔ اس میں ایک واضح کشمکش موجود ہے جیسے روح کی ساری جدوجہد جسم میں منتقل ہو گئی ہو۔ زندگی، محبّت، جذبۂ تخلیق کے بنیادی حقائق کا اظہار اس رقص میں پورے خلوص سے نمایاں ہے۔ یہ اظہار جو غیر ارادی ہوتا ہے۔ جس میں حزن ہے، بیتابی ہے مگر بلا کی جاذبیت بھی ہے۔

رقاصہ تنہا کھڑی ہوئی اس پھُول کی طرح معلوم ہوتی ہے جو شعاعوں کی تمازت، تھکن اور نیند کے احساس سے مغلوب ہو چکا ہو۔ اس کے گورے بازو پانی میں

تیرتے ہوئے کنول کے لمبے ڈنٹھل ہیں۔

یکایک وہ کانپتی ہے۔ اس کے دل کو کسی شدید جذبے نے چھُوا ہے۔ ایک لہر کے بعد دوسری آتی ہے۔ شدّتِ احساس سے اس کا جسم لرزنے لگتا ہے۔

اب وہ صبح کے دُھندلکے میں کھلے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی ہے۔ پھُول جو سُورج کی پرستش کے لیے خاموش کھڑا ہے، جن کی پنکھڑیوں سے شبنم کے قطرے ڈھلک رہے ہیں۔

وہ بیدار ہو رہی ہے۔ زندگی نے دفعتاً اُسے بازو سے آن پکڑا۔ اس کا سر پیچھے جھک جاتا ہے۔ اس کے بازو کسی غیر مرئی شے کو آغوش میں لے لیتے ہیں۔ اس کے ہونٹ ایک اَن جانے بوسے کی لذّت سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ آنکھیں کھولتی ہے۔ پلٹ کر وہ اس کا تعاقب کرتی ہے۔ اس کی روح بے چین ہے۔ وہ تیزی سے سانس لے رہی ہے۔ اس کرب سے نجات پانے کے لیے وہ تگ و دو کرتی ہے۔ رقص کی ایک ایک جنبش سے یہ جدوجہد عیاں ہے۔

آخر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہے۔ اب وہ آزاد ہے۔ فرطِ انبساط سے اس کا رواں رواں پھڑک رہا ہے۔ مجیرے بجتے ہیں، تار تھرتھراتے ہیں۔ گویّے کی لَے کے ساتھ ترنگ میں ناچ رہی ہے۔

یہ وجدانی حالت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ رقاصہ پر ایک نئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زندگی کی مضبوط گرفت نے اسے دبوچ لیا ہے۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہے۔ اعضاء تھکے تھکے سے ہیں۔ وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر آہیں ہیں۔ اس کی آنکھیں نمناک ہیں۔

اب وہ ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ خاموش۔ تنہا۔ گٹار سسکی بھر کر خاموش ہو جاتی ہے، رقص تمام ہوتا ہے۔

غرناطہ سے اشبیلیہ تک جگہ جگہ دھوپ میں چمکتے ہوئے سفید صاف سُتھرے گاوں آتے ہیں۔ زیتون، نارنگیوں اور کھجوروں کے درخت۔ ہر گاؤں میں مینار اور گنبد دار عمارتیں جو کبھی مسجدیں تھیں۔۔ اب تک طرزِ تعمیر وہی پرانا ہے۔

عربوں کو درختوں سے ہمیشہ محبّت رہی۔ عبدالرحمٰن اوّل نے کھجور کا پہلا پودا شام سے منگوا کر قرطبہ میں بویا تو وطن یاد آیا اور اس نے وہ نظم کہی جو اب تک شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

اشبیلیہ میں پلاؤ کھایا۔ نارنجاس (نارنگیاں) آئیں تو چاقو ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ برساتی غائب تھی۔ فوراً کمرے میں پہنچے، وہاں نہیں ملی، صندوق کھولے، کار میں دیکھا، ہوٹل والوں سے پوچھا لیکن نہیں ملی۔

غرناطہ فون کیا۔ برساتی کا حلیہ بتایا جواب ملا آپ تحفے خریدتے وقت برساتی ایک دکان پر چھوڑ آئے تھے، ایک بڑھیا اسے پہنچا گئی ہے لیکن آپ کی برساتی سبز نہیں سبزی مائل ہے اور اس کی جیب میں دستانے ہیں اور بیس پیسٹے بھی۔ آج شام تک اشبیلیہ پہنچ جائے گی۔

شام سے پہلے برساتی مل گئی۔ لاری ڈرائیور نے کرایہ نہیں لیا، غرناطہ والے ادا کر چکے تھے۔

اشبیلیہ کی سب سے مشہور عمارت القصر ہے جو ہو بہُو الحمراء کی نقل ہے۔ غرالدہ کبھی مسجد کا مینار تھی۔ اب گرجے کا مینار ہے۔ اس میں سیڑھیاں نہیں ہیں۔ سادہ چڑھائی ہے۔ ہمیں بے حد فُرقت زدہ گائیڈ ملا۔ شاید اس کی محبوبہ اس سے بیزار تھی یا VICE VERCA۔ اس نے ہمیں ڈون جو آن کی قبر دکھائی جو گرجے کی سیڑھیوں کے عین نیچے ہے۔ چڑھنے والا کتبے کے اوپر سے گزرتا ہے۔ مرحوم کی آخری خواہش کے مطابق کتبے پر لکھا ہے "یہاں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار سو رہا ہے۔ اسے پاؤں تلے روندیئے۔"

ڈون جو آن چلتے چلتے بھی سکور کر گیا۔ ایسا کتبہ کسے نصیب ہوتا ہے؟

ایک گرجے میں کولمبس کی ہڈیاں دفن ہیں۔ لیکن جنوبی امریکہ والے کچھ اور

کہتے ہیں۔ دراصل کولمبس اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ متعلقہ ممالک میں سے ہر ایک نے اسے اپنے ہاں دفن کیا۔

"یہ وہ سگریٹ فیکٹری ہے جہاں مشہور رقاصہ کارمن ملازم تھی۔" گائیڈ ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔

"اور وہ دکان کہاں ہے جہاں مشہور باربر آف سویلیہ کام کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

ہم بُل فائٹنگ کے اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے۔

"سردیوں میں بُل فائٹنگ نہیں ہوتی کیونکہ سارے بُل فائٹر آرام کرتے ہیں۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"اور غالباً بیل بھی آرام کرتے ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

اس کا نام کارلوز باربُلا تھا۔ اندلس میں ایسے نام اب تک ہیں جو باشندوں کی نسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ رکارڈو ڈی مڈینہ (مدینہ کا رچرڈ) کارلوز الحروز (چارلس الحر) گائیڈ کی افسردگی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور ہم پلاؤ کھانے لوٹ آئے۔

ہم نظاروں کے کارڈ خریدتے۔ پورا سیٹ خریدنا پڑتا۔ اس لیے کچھ اوٹ پٹانگ

کارڈ بھی آجاتے۔ چنانچہ گرجوں وغیرہ کے نظارے جولیا کو ارسال کیے جاتے۔ جولیا سخت مذہبی قسم کی لڑکی تھی۔ کٹر رومن کیتھولک۔ شرعی سکرٹ پہنتی یعنی ٹخنوں تک نیچی۔ جمعے کو گوشت سے پرہیز تھا، جمعرات کو انڈوں سے، بُدھ کو مچھلی سے، تو اتوار کو سینما سے۔ تقریباً ہر روز اس کا کسی چیز سے روزہ ہوتا لیکن ماشاءاللہ تھی خوش خوراک۔ ایک ہی دن میں ہفتے بھر کی کسر نکال لیتی تھی۔

اشبیلیہ میں سال کی آخری رات تھی۔ میں تیار ہوا تو دیکھا کہ میرا دوست سویا پڑا ہے۔ اسے جگایا ”بھئی کوٹ کی جیب میں بٹوہ ہے۔ تم اکیلے ہو آؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں۔“

پڑوس کی رقص گاہ میں بڑی رونق تھی۔ جدھر نظر جاتی۔ ادھیڑ عمر کے مرد عورت دکھائی دیتے۔ یورپ میں یہ بڑی مصیبت ہے۔ کسی اچھی جگہ جاؤ۔ فقط بنے سنورے بوڑھے بوڑھیاں نظر آتے ہیں۔ شاید یہ زندگی کا قانون ہے۔ جب خون میں حرارت اور طبیعت میں جولانی ہوتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ سارے کام اُلٹے ہوتے ہیں اور جیب خالی ہوتی ہے۔ جب حالات بہتر ہونے لگتے ہیں تو دل بجھ جاتا ہے اور مسرّتوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ہر چیز ذرا دیر میں ملتی ہے۔

واپس لوٹا تو ہوٹل والے نے روک لیا۔ ''آج تو جگہ جگہ جشن ہوں گے۔ اگر آپ آج سو گئے تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔"

''تو اوپر سے برساتی منگا دیجئے۔"

برساتی پہن کر میں باہر نکلا۔ وادی الکبیر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ بڑی سہانی رات تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ غرالدہ کو آج روشن کیا گیا تھا۔ اس خوشنما مینار کو دیکھتا رہا۔ اتنی بلندی سے مؤذن کی آواز نیچے نہیں پہنچتی ہو گی۔ پھر چمکتے ہوئے تاروں نے یاد دلایا کہ عرب مسجد کے بلند میناروں سے رصد گاہ کا کام بھی لیتے تھے۔

اونچی عمارات کا سلسلہ ختم ہوا تو کُنج آئے جہاں الاؤ روشن تھے، شور مچا ہوا تھا۔ ہجوم میں ایک گویّے نے تان اٹھائی اور اس طرح مُرکی لگائی کہ اُستاد فیاض خاں یاد آ گئے۔

یہاں BOLERO ہو رہا تھا۔ اس رقص میں ہنگامہ زیادہ ہے۔ لوگ دائرے میں کھڑے ہو کر تالیاں بجا بجا کر تال دیتے ہیں۔ ایک طرف سے لڑکا نکلتا ہے۔ مخالف سمت سے لڑکی۔ وہ لڑکے کی موجودگی سے بظاہر بے خبر ہے۔ لڑکا طرح طرح کے حیلوں سے اُسے اپنی جانب متوجّہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سینوریتا کے ہاتھوں میں CASTANETS ہیں جنہیں وہ بھی تال دینے کے لیے بجاتی ہے۔ بھی والہانہ انداز میں تو کبھی محض شرارتاً۔

متواتر چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر وہ لڑکے کی طرف بڑھتی ہے، لیکن کچھ اس انداز سے جیسے حملہ کر رہی ہو۔ لڑکے کے قدم زمین پر جمے رہتے ہیں لیکن وہ بدن کی جنبش سے وار بچا جاتا ہے۔ لڑکی بالکل چھوتی ہوئی برابر سے گزر جاتی ہے۔

''اولے OLE'' ہجوم چلاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ان کے آباؤ اجداد ''واللہ'' کہہ کر داد دیا کرتے تھے۔

وہ سر کو بار بار جھٹکتی ہے۔ سیاہ زلفیں بکھر جاتی ہیں۔ بالوں میں ٹنکے ہوئے پھُول گِر جاتے ہیں، بل کھاتا ہوا جسم مچل جاتا ہے۔ گٹار کے نغمے کا زیر و بم نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ لڑکا پھر چھیڑتا ہے۔ وہ آتی ہے۔ یہ دامن بچا جاتا ہے۔

''اولے!'' ہجوم داد دیتا ہے۔

رقص کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہونا چاہیے۔ لڑکے کی مدافعت گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے۔ نسوانی جادو اپنا کام کر جاتا ہے۔ اب لڑکی اپنے لباس اور چوڑیوں سے کھیل رہی ہے اور وہ دیوانہ وار اس کے گرد طواف کر رہا ہے۔

گانے، تالیوں اور سازوں کے شور میں شراب کا دَور چلتا ہے۔ ایک نیا جوڑا ناچنے لگتا ہے۔ جہاں اس رقص میں خمار و مستی ہے وہاں محبّت کے تمام حربوں کی ترجمانی بڑے خلوص سے ہوتی ہے۔ اس رقص کے کچھ حصّے بل فائٹنگ سے بہت ملتے ہیں۔ بالکل اسی کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔

میری باری آئی۔ تب تک میرے چند واقف بن چکے تھے۔ سینوریتا فلاویا کی فرمائش پر میں نے سیاہ کوٹ اور بَو اتار کر اُس کی بہن کے حوالے کیے۔ کالر کھول کر اور بال پریشان کر کے میدان میں کود پڑا۔

ٹِک ٹِکا ٹِک ٹِکا ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک۔ فلاویا کے CASTANETS بجے۔ ٹِپ ٹِپا ٹِپ ٹِپا ٹِپ ٹِپ ٹِپ میں نے ایڑیوں سے تال دی۔

میں سفید قمیص سیاہ چُست پتلون پہنے، ٹھوڑی نیوڑھائے، پنجوں کے بل تنا ہُوا کھڑا تھا۔ بالکل بُل فائٹر کے انداز میں۔

دہنا کندھا اور دہنا پاؤں آگے کر کے میں فلاویا کی طرف پنجوں پر گھوما۔

چھنا نن۔۔۔ چھن۔۔۔ چھن۔۔۔ اس کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ایک اُچٹتی نگاہ ڈالتی ہوئی وہ اتنے قریب سے گزری کہ میرے بال اور بھی پریشان کر گئی۔ گویّے نے پھر اُستاد فیاض خاں کی طرح انترہ اٹھایا۔ فلاویا نے دونوں بازو

پھیلائے میرے چہرے کا ہالہ بنا کر انگلیاں یوں نچائیں جیسے بلائیں لیتے ہیں۔ بالکل یہی میں نے کیا۔ میں آگے بڑھا لیکن وہ تڑپ کر بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔

"اولے۔۔ اولے۔"

لَے اب چلنتر میں تھی۔ رقص تیز ہوتا گیا۔

پھر الاؤ بجھنے لگے، چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو چاند کھجوروں کے جھنڈ میں غروب ہو رہا تھا۔

ایک امریکن نے ہم سے کہا کہ وہ ہمیں شہر تک اپنی کار میں لے جا سکتا ہے۔ فلاویا کی بہن کے کہنے پر ہم سب کار میں بیٹھ گئے۔ ایک لڑکی امریکن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کسی مذاق پر اُس نے ہسپانوی زبان میں کچھ کہا جس کے معنی تھے، "میں سینوریتا ہوں، مجھے کچھ نہ کہنا۔" ہم سب ہنسنے لگے۔ اتفاق سے امریکن کی کہنی اُسے چھُو گئی اس نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔ اتنے میں فلاویا نے اپنی بہن سے کچھ کہا جس میں سینوریتا کا لفظ دو مرتبہ آیا۔

امریکن جو غالباً مدہوش تھا طیش میں چلایا "سُن لیا بابا سُن لیا۔ تم بھی سینوریتا ہو۔ یہاں سینوریتا کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

فلاویا غصّے سے لال بھبھوکا ہو گئی۔

"کار روکیے، میں اُترنا چاہتی ہوں۔"

کار رُکی، فلاویا اُتری، میں بھی اُتر گیا۔ ہم کافی دُور مضافات میں تھے۔

"تم ناحق اُتر گئے۔ اجنبی ہو۔ ضرور راستہ بھول جاؤ گے؟"

"لو یہ برساتی پہن لو۔ سردی ہے۔" بڑے اصرار سے میں نے اسے برساتی پہنائی۔

ہم وادی الکبیر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔

"پتہ نہیں میری بہن گھر جا کر کیا شکایتیں کرے گی۔"

"تو پھر میں شام کو تمہاری گلی میں SERENADE کرنے نہ آؤں؟"

وہ ہنسنے لگی "ضرور آنا۔ میں سیاہ میتیلا پہن کر بالوں میں پھول لگا کر دریچے میں انتظار کروں گی۔"

"لیکن تم اپنے نازک سے پنکھے سے چہرہ چھپا لو گی۔"

"تمہیں سب پتہ ہے۔ اچھا نہیں چھپاؤں گی۔"

جب اس کا گھر آیا تو مشرق میں روشنی پھیل چکی تھی۔

"تو پھر تم آؤ گے؟"

"نہیں فلاویا۔ اب ملاقات نہیں ہو گی۔ میں آج قرطبہ جا رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے برساتی کو سُرخ ہونٹوں سے بار بار چوما۔

"میں تمہیں ہر نئے سال کی رات کو یاد کیا کروں گی۔"

قرطبہ ویرانی کی تصویر ہے۔ محزوں، المناک، قرطبہ ایک مُردہ شہر ہے جس میں روحیں بستی ہیں۔ پرانے محلوں میں کھنڈروں کے آس پاس کھجور کے درختوں کے نیچے وادی الکبیر کے کنارے دہشت ناک خاموشی ہے۔ جیسے اجل کو رُخصت ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شہر ہے جسے یورپ کے ایّامِ جہالت میں ایک فرانسیسی راہبہ نے "دنیا کا ہیرا" کہا تھا۔

میں وادی الکبیر کے پُل پر کھڑا ہوں سامنے مسجدِ قرطبہ کا مینار ہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کا محل۔ عربوں کا بنایا ہوا۔ یہ پُل اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ مسجدِ قرطبہ اب بھی اتنی ہی حسین و جمیل ہے۔ مدینۃ الزہرا کے کھنڈر اس کی گزشتہ عظمت کے گواہ ہیں۔

یہ شہر ایک زبردست تہذیب کا مقبرہ ہے۔

دسویں صدی میں یہاں ڈھائی لاکھ مکان تھے۔ دس لاکھ باشندے یہاں رہتے تھے۔ لندن کو یہ آبادی کہیں انیسویں صدی میں نصیب ہوئی۔ یہاں میلوں لمبی پُختہ سڑکیں تھیں جن پر رات کو روشنی ہوتی تھی۔ اس زمانے کے سات سو سال بعد تک لندن کی کسی سڑک پر ایک لیمپ تک نہ تھا۔ قرطبہ میں ستّر لائبریریاں تھیں۔ خلیفہ الحکم کی لائبریری میں پانچ لاکھ کتابیں تھیں۔ المنصور نے باون لڑائیاں لڑیں اور ہر مرتبہ فتح یاب ہوا۔ عیسائی یورپ کے تمام ممالک اپنے سفیر یہاں بھیجنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈوزی لکھتا ہے کہ ان دنوں اندلس میں تقریباً ہر شخص پڑھ لکھ سکتا تھا۔ عیسائی یورپ میں صرف گنے گنائے پادری تعلیم یافتہ ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ اندلس کی عورتیں آزاد تھیں اور بغیر نقاب کے بِلا روک ٹوک باہر نکلتیں۔ ان

میں سے بیشتر نے حکومت کے ذمہ دار عہدے سنبھال رکھے تھے۔

آٹھویں صدی سے تیرہویں صدی تک دنیا بھر میں عربی بولنے والے ہی وہ واحد لوگ تھے جنہوں نے تہذیب و تمدّن کی شمع تھامے رکھی۔ یہ روشنی سِسلی ہو کر مغربی یورپ پہنچی اور تحریک احیائے علوم کا باعث بنی۔

ہسپانیہ کے عرب بڑے مہذب تھے۔ بارہویں صدی میں مراکش سے کاغذ سازی کی صنعت ہسپانیہ میں آئی۔ تیرہویں صدی میں اسے ہسپانیہ سے اٹلی لایا گیا۔ یورپ پر عربوں کا یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

سولہویں صدی تک پیرس کی یونیورسٹی میں طِب کے طلباء کو بارہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ سب عربی کتابوں کے ترجمے تھے۔

یونانی ادب ہم تک عربوں کی وساطت سے پہنچا ہے۔

اب بھی ابنِ رشد (Averros) کا ذکر فلسفے کی ہر کتاب میں ہوتا ہے۔ اشبیلیہ کا ابن ظہر (Avenzoar) اور عظیم شاعر، فلسفی، نثر نگار سیاستدان، ابن حزم اور مشہور سرجن ابوالقاسم جس کی تقلید یورپ میں صدیوں تک ہوئی۔

یہاں سوشلزم صحیح معنوں میں رائج تھا۔ المنصور پہلے کلرک تھا۔ ترقّی کرتے

کرتے ملک کا حکمران بن گیا۔ یہاں مفتوحہ عیسائی مطمئن تھے۔ ہر شہر میں ان کے گرجے تھے۔ اُن کے لیے قانون بھی اُن کا اپنا تھا۔ ان کے جج اپنے تھے۔ ہسپانیہ کے سفیر اکثر عیسائی ہوا کرتے۔ عبدالرحمن سوئم کا حفاظتی دستہ بارہ ہزار عیسائیوں پر مشتمل تھا۔

نفاست اور نستعلیق پن میں مسجدِ قرطبہ کا مقابلہ قدیم یونانی عمارات سے کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور طرزِ تعمیر ایسا نہیں جو ایسے لطیف تاثرات پیدا کرتا ہو۔

گا تیر جب یہاں آیا تو ستونوں اور خوشنما محرابوں کے جھنڈ کو دیکھ کر اسے عرب کے نخلستان یاد آئے اور وہ محبّت بھی جو عربوں کو درختوں سے رہی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے راتوں رات سنگِ مرمر کا جنگل کا جنگل اُگ آیا ہے۔ نو سو نازک ستون (جو کبھی بارہ سو تھے) جنہیں کار تھیج، روم اور بازنطینی سلطنت سے لایا گیا۔ ہر ستون سے دو محرابیں، ان محرابوں پر سُرخ نقوش ہیں۔ جدھر نظر جاتی ہے ستونوں کی قطاریں اور محرابوں کی شاخیں نظر آتی ہیں۔ ستون اتنے نازک ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تیز ہوا چلی تو سب کچھ گر پڑے گا۔ یقین نہیں آتا کہ بارہ سو سال سے یہ عبادت گاہ جوں کی توں کھڑی ہے۔ عیسائی فاتح اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے تباہ نہیں کیا لیکن اس میں گرجا تعمیر

کر دیا۔ بٹن کو اس حسین عمارت کے شکستہ قلب میں یہ گرجا ایسا لگا جیسے استغراق و دعا میں ایک گستاخ قہقہہ۔

ان دنوں مسجد کے ہر دروازے پر ایک چھوٹا سا گرجا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ فرانکو مسجد کو پرانی حالت پر لانا چاہتا ہے۔ مدینۃ الزہرا ابھی از سرِ نو تعمیر ہو گا۔

"یہاں وہی ہوا جو سینٹ صوفیہ میں تُرکوں نے کیا۔ میں رومن کیتھولک ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ یہاں سے گرجے ہٹا دیئے جائیں۔ ستون دوبارہ نصب کیے جائیں۔ ہسپانوی رگوں میں عربوں کا خون ہے۔ یہ مسجد ہماری قومی یادگار ہے۔" گائیڈ کہہ رہا تھا۔

قرطبہ سے دس میل دور مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات ہیں جسے ہسپانیہ کا پاپمپئی کہا گیا ہے۔ اسے خود بَربَروں نے تباہ کیا۔ فرانکو کے انجنیئر اسے دوبارہ تعمیر کر رہے ہیں۔

ہسپانیہ سے ہم اداس ہو کر لوٹے۔

سان سبستیاں پر فرانس میں داخل ہوئے تو میرا دوست لین پول کی کتاب کے یہ فقرے سُنا رہا تھا "ہسپانیہ سے عرب کیا گئے سونے کی چڑی اُڑ گئی۔ مُستعار شدہ روشنی سے یہ ملک کچھ دیر جگمگایا پھر اسے ہمیشہ کے لیے گہن لگ گیا۔"

واپس ایڈنبرا پہنچا۔ برفباری ہو رہی تھی۔ یخ کر دینے والی سردی اور تند ہوا جو غالباً سیدھی قطب شمالی سے آ رہی تھی۔ ایک ہم وطن نے فون کیا "سُنا ہے آپ ہسپانیہ گئے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کب۔"

"کل جمعہ ہے آپ میرے ساتھ نماز پڑھیے۔"

میں گیا۔ نماز کے بعد انہوں نے فرمایا "میں بھی ہسپانیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ بڑا اچھا اسلامی ملک ہے۔"

میں نے انہیں بتایا کہ ہسپانیہ اسلامی ملک نہیں ہے تو انہوں نے فوراً ارادہ تبدیل کر دیا۔

ہر روز بارش ہوتی۔ ہر روز لیکچر ہوتے۔ دن رات بجلی کی روشنی میں پڑھائی ہوتی۔ لیکن یہ خوشی تھی کہ تین مہینے کے بعد ایسٹر کی چھٹیاں ہوں گی۔ شام کو تھک کر

آتا تو نقشے دیکھتا اور نئے سفر کا پروگرام بناتا۔ ایک ایک دن گننے کے بعد انتظار ختم ہوا اور تعطیل شروع ہوئی۔

میں پھر رودبار انگلستان عبور کر رہا تھا۔ برساتی کی دونوں جیبیں نقشوں اور گائیڈ کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس مرتبہ سیدھا FRENCH RIVIERA پہنچا۔

نیس میں خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں دن بھر بحیرہ روم کے ساحل پر بیٹھا لہریں گنتا رہا۔

برطانیہ یورپ کے اس حصّے سے کس قدر مختلف ہے۔ وہاں مٹیالے رنگوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس نظر آتے ہیں۔ غذا کے جزو وہی ہیں لیکن باورچی خوب ستیاناس کرتے ہیں۔ لوگ پھیکے، بدمزہ کھانے کو چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں۔ فِش اینڈ چپس کے ساتھ ساتھ انگریزی کسیلی بئیر کے گھڑے کے گھڑے پی جاتے ہیں۔ ناگوار اور تیز قسم کی دُھنوں پر لڑکیاں آدھی رات تک پریڈ کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ رقص کر رہی ہیں۔ یہاں دیدہ زیب چُست لباس ہیں کلاسیکی موسیقی، لذیذ غذا اور خوش رنگ وائن۔ وہاں اگر کوئی کہے کہ اسٹیشن تک صرف پندرہ منٹ کا راستہ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگر سرپٹ بھاگتے ہوئے

گئے تب پندرہ منٹ میں پہنچ گئے۔ یہاں سو گز چلنے میں آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔ وہاں ہر چیز کی جلدی ہے۔ انگریز کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ وہ زمین دوز ریل میں چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جارہا ہے۔ باربار گھڑی دیکھتا ہے۔ بھاگ کر بس پکڑتا ہے۔ پھر ایک ٹرین میں سوار ہوتا ہے اور اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد چُپ چاپ آدھے میل ہے کیو میں کھڑا ہو جاتا ہے، فلم یا میچ دیکھنے یا کھانا کھانے کے لیے۔ ممکن ہے کہ سڑک پر دوڑتے ہوئے انگریز کو دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ وہ دونوں کہیں شراب پیئیں گے یا کتّوں کی دوڑ پر شرط لگائیں گے۔ یا وہ محض اس لیے بھاگ رہا ہے کہ باقی سب انگریز بھی بھاگ رہے ہیں۔

لیکن یہاں کسی چیز کی جلدی نہیں۔ یہاں اگر کسی نے پانچ منٹ بچا بھی لیے تو بیکار ہیں۔ بھلا وہ ان پانچ منٹوں کا کرے گا۔

وہاں افراتفری ہی رہتی ہے۔ بسوں اور ٹرینوں میں مرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ عورتیں کھڑی ہیں۔ اکثر مرد جیب سے اخبار نکال کر چہرے کے سامنے کر لیتے ہیں۔ وہ عورتوں کو کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ میں اکثر کسی عورت کو جگہ دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ مرد بڑے تعجّب سے میری طرف دیکھتے۔ ایک صاحب کہنے

لگے "تمھیں کام پر جانا ہے۔ بار بار اُٹھ کر اپنی جگہ لڑکیوں کو بٹھاتے رہے تو تھک جاؤ گے۔"

ایک دن ایک بوڑھا جو فلسفی معلوم ہوتا تھا بولا "سر والٹر ریلے! شولری کے دن بیت چکے، اب عورت مرد برابر ہیں۔ بلکہ یہاں سولہ سترہ لاکھ عورتیں فالتو ہیں- ہمارا اُن کا مقابلہ ہے۔ اگر تم چوکنّے نہ رہے تو کسی دن ایک عورت کرسی سے تمھیں اُٹھا کر تمہارا کام خود سنبھال لے گی۔"

یہاں ملتے وقت مرد جھک کر عورت کا ہاتھ چومتے ہیں۔ آدابِ محفل پر بڑی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا ہے لیکن یہاں غربت ہے، سُستی ہے اور بےزاری ہے۔

کرائے کی کرسی پر میں دن بھر سمندر کے کنارے بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اور لوگ مجھے دیکھتے رہے۔

مانٹی کارلو کا مشہور قمار خانہ دُور سے مسجد معلوم ہوتی ہے۔ سبز مینار اور گنبد۔ لیکن رات کو کچھ اور ہی سماں ہوتا ہے۔ ہر روز انسانی رجائیت کے اس مندر میں لوگ اُمّیدیں لے کر آتے ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ زیادہ لوگ ہارتے ہیں۔

Cannes میں دکانوں پر بڑی بڑی ہستیوں کی نہایت عجیب و غریب تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ریٹاہورتھ سمندر میں نہاتے ہوئے۔ بھوئیں غائب ہیں اور میک اپ اُترا ہُوا، چہرے پر طرح طرح کے نشان، کوئی قسم کھائے تب بھی اعتبار نہیں آتا کہ سامانِ آرائش سے اتنی کایاپلٹ ہو سکتی ہے۔ فاروق نے سمندر میں غسلِ صحت کرتے ہوئے بکینی سوٹ پہنا ہوا ہے۔ اس برائے نام لنگوٹ میں فربہی پوری شان وشوکت سے نمایاں ہے۔

کھانے کی میز پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون پہلی شام کو دیکھتی رہتی ہے۔ دوسری شام کو مُسکراتی ہے۔ میں پاس جابیٹھتا ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکی بھی ہے۔

"آپ کون سی زبان سمجھتے ہیں؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔

"وہی جو آپ بول رہی ہیں۔"

"معافی چاہتی ہوں۔ بغیر تعارف کے مرد سے عورت کا بات کرنا آداب کے خلاف ہے۔ لیکن آپ تنہا بیٹھے تھے سوچا کہ اجنبی ہوں گے۔ چنانچہ میں نے بُلا لیا۔"

ان کا بھی باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر تو ضبط کیا۔ آخر کہہ ہی دیا۔ ہم دونوں اکیلی ہیں، اس طرح ہمارا باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ ہمیں نائٹ کلب لے چلیں

تو ہم مشکور ہوں گے۔ یہ میری بیٹی ہے۔ ہیلن ان سے گفتگو کرو۔"

ہیلن حسین تھی لیکن بے حد اداس۔ مادام کا خاوند جنوبی فرانس کا مشہور ڈاکٹر تھا۔ دونوں سیر کرنے نیس آئی تھیں۔

رقص کرتے ہوئے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہیلن اب رو دے گی۔

"ٹرائے کی ہیلن اداس کیوں ہے؟"

پھر ایک غم آمیز مُسکراہٹ لبوں پر آئی "جی نہیں اداس تو نہیں ہوں۔"

واپسی پر مادام نے ایک طرف لے جا کر بتایا کہ ہیلن عارضۂ عشق میں بُری طرح مبتلا ہے اور غلطی سے ایک ایسے لڑکے پر عاشق ہو گئی ہے جو بیک وقت چھ لڑکیوں کا عاشق ہے۔ تین لڑکیوں سے منگنی کرا چُکا ہے۔ دو سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور افواہ ہے کہ اس کا ایک بچّہ بھی ہے۔ سخت نامعقول قسم کا آدمی ہے۔ کام وام کچھ نہیں کرتا۔ دن بھر ڈنڈے بجاتا ہے۔

"میں تم سے درخواست کرتی ہوں میری مدد کرو گے؟"

"فرمایئے؟"

"اُس کی توجّہ اُدھر سے ہٹا دو۔ مہینوں کے بعد یہ آج مُسکرائی۔ محض اس لیے

میں یہاں کھینچ کر لائی ہوں کہ کسی طرح اُسے بھول جائے۔"

"مادام مجھے اپنے غم ہی نہیں چھوڑتے اور پھر میں یہاں صرف چند دنوں کے لیے ہوں۔"

"مجھے مایوس مت کرو۔ میرا خاوند اور میں نہایت غمگین ہیں ہماری مدد کرو۔" مادام رونے کی تیاریاں کرنے لگی۔

"اچھا! اچھا؟" میں نے جلدی سے کہا۔

اگلے دن ہم تینوں سیر کو گئے۔ موٹر بوٹ لے کر اُن جزیروں کی سیر کی جہاں DUMAS کے کردار قید رہے تھے۔ پھر سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ گئے۔ موسم صاف تھا۔ دور سمندر میں ایک دھبّہ نظر آرہا تھا۔

"ہیلن وہ دیکھو جزیرۂ کارسیکا۔ نپولین کا وطن۔ یہاں عربوں کی اولاد اب تک آباد ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ نپولین کی رگوں میں بدوؤں کا خون تھا۔"

فرانس کے سب سے بڑے ہیرو کے متعلق یہ سن کر ہیلن نے احتجاج کیا۔

"بھئی نپولین تمہارا ہی تھا لیکن مؤرّخ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں آمیزش تھی۔"

شام کو نائٹ کلب میں مادام ہم دونوں کو چھوڑ کر خود بوڑھوں کی محفل میں جا بیٹھی۔

"کیا وہ اب بھی تم سے ملتا ہے؟"

"نہیں بات تک نہیں کرتا۔"

"اور تمہیں اب بھی پسند ہے؟"

"ہاں۔"

اس کے رخسار پر راکھ کا چھوٹا سا ذرّہ تھا جسے میں نے اُنگلی سے ہٹا دیا۔ اس کی آہیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔

"ناچنا ہے تو سیدھی طرح ناچو، ورنہ جاؤ اپنی امّی کے پاس۔"

"پہلے میں اسے بھُلالوں پھر"

"اچھا جلدی کرو۔ تمہیں آدھا گھنٹا دیتا ہوں۔ پھُرتی سے بھُلادو۔"

وہ ہنسنے لگی۔ ہیلن کو بشاش دیکھ کر مادام کی باچھیں کھل گئیں۔ "یہ مدّتوں کے بعد ہنسی ہے۔ اسے باہر لے جاؤ سمندر کے ساحل پر۔"

ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ پھر اس عاشقِ جانباز کا ذکر چھڑ گیا۔

"تم نے جس انداز سے اس کی تعریفیں کی ہیں میں بھی اس پر عاشق ہو گیا ہوں۔ اب ہم دونوں رقیب ہیں۔ آؤ سمندر میں کنکر پھینکیں۔ جو دُور پھینکے گا وہی جیتے گا۔"

ہم کنکر پھینکنے لگے۔

"تم جان بوجھ کر ہار رہے ہو۔" وہ مچل گئی۔

"نہیں میں اس بُتِ طنّاز کو جیتنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

"کہاں ہے پتھر؟ دکھاؤ اپنا ہاتھ۔"

میں نے دوسرا ہاتھ دکھا دیا۔

"تم وائلن بجاتے ہو؟"

"کیوں؟"

"یہ تو آرٹسٹ کی اُنگلیاں ہیں۔"

"تمہیں وائلن پسند ہے؟"

"بہت، اس کا وائلن بجانا ہی تو مجھے پسند آ گیا تھا۔"

"شاید تمہیں علم نہیں کہ وائلن کے تار بلّی کے پوست سے بنتے ہیں اور اس کے گز میں گھوڑے کی دُم کے بال ہوتے ہیں۔ غالباً تمہیں جانور پسند ہیں؟"

"ہاں۔"

"تبھی اُسے پسند کرتی ہو۔ چلو واپس چلیں۔"

"نہیں۔ یہاں بیٹھیں گے۔"

ہم برساتی بچھا کر بیٹھ گئے۔

"یہ لہریں کتنی اچھّی لگ رہی ہیں، خصوصاً ان کا جھاگ"

"ان لہروں کے پیچھے تم سے بڑے بڑے مگر مچھ تیر رہے ہیں۔"

مگر مچھ سے ڈر کر اس نے میرا بازو تھام لیا۔

"مجھے سپاہی بہت پسند ہیں، لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ مُسافر ہوتے ہیں اور چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"مگر جو سپاہی نہیں ہوتے وہ کہیں بھی نہیں جاتے۔ ہمیشہ وہیں کے وہیں رہتے

ہیں۔"

"لیکن سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"اپنے وطن میں تمہاری کوئی محبوبہ ضرور ہوگی۔ ہے نا؟"

"میرا وطن ہر جگہ ہے۔ میرا وطن کرۂ ارض ہے اس لئے کہ میں کسی دوسرے سیّارے تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"اور محبوبہ؟"

"سپاہی کی محبوبہ نہیں ہوتی اور اتنی چھوٹی لڑکیوں کو ایسے وقت باہر نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم مجھے چھوٹی لڑکی سمجھتے ہو۔ میں انیس برس کی ہوں۔"

"میں بھی انیس برس کا ہوں۔"

"انیس برس؟"

"انیس برس اور تقریباً ڈیڑھ سو مہینے۔"

ہم ریت پر چلنے لگے۔ وہ جس طرف ہوتی میں برساتی اُسی بازو میں تھام لیتا۔

"یہ برساتی ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ رہتی ہے"

اگلی شام کو ہم پھر وہیں بیٹھے تھے۔ ہیلن بولی "کل ہم دونوں منیتون چلیں گے۔"

"نہیں بخدا اب مجھے اٹلی جانا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

"اگر تم اداس ہوئیں تو میں سمجھوں گا کہ تم بدستور اس پر عاشق ہو۔"

"نہیں۔ بخدا اب مجھے اس کی پروا نہیں سچ مُچ"

"ہیلن صرف چند دنوں میں تمہاری پہلی محبّت تمام ہوئی۔ شاید یہ جذبہ اتنا شدید نہ تھا۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اب تم خوب ہنسو کھیلو اور اگلی مرتبہ کسی کام کے آدمی سے محبّت کرنا بلکہ بہتر یہی ہو گا کہ خود کسی پر عاشق نہ ہونا دوسروں کو بے شک عاشق ہونے دینا ورنہ میں جہاں بھی ہُوا خفا ہو جاؤں گا۔"

"مگر تم کہاں ہو گے؟"

میں نے ملکِ خُدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست کا ترجمہ کر کے سُنایا جو اچھی طرح نہ ہو سکا۔ ہیلن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''تم فرانس پھر آؤ گے نا؟''

''شاید'' کہہ کر میں نے 'وارث شاہ تیرے ساڈے حشر میلے' کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی لیکن نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔

''تمہارا بازو کہاں ہے؟ یہ برساتی پھر کہیں سے آگئی۔''

''میں۔ ہیلن اور برساتی ازلی تکون ہے۔''

فرنچ رویرا سے اٹلی کو سڑک بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ایک طرف چمکدار نیلا سمندر ہے۔ دوسری طرف باغوں سے لدی ہوئی پہاڑیاں جن کی چوٹیوں پر قدیم رومن وضع کے مکان بنے ہوئے تھے۔ یہ ساحل پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ستونوں سے لپٹی ہوئی بیلیں، سیب اور شفتالو کی نوخیز کلیاں، نارنگیوں کُنج اور سرو کے درخت۔

دھوپ میں نیلے پیلے آبی سُرخ سفید گلابی پھول چمکتے ہیں۔ سمندر سے ہوا کے خنک جھونکے آتے ہیں تو پودے جھومتے ہیں۔

ایک لمبی سی سُرنگ آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ایک ہم سفر بھی ہے۔ ہم باتیں کرنے لگے کہ بحیرۂ روم نے دنیا کی تاریخ میں کتنا اہم حصّہ لیا ہے۔ اس

کے کنارے پر تہذیبیں اُبھری اور مِٹی ہیں۔ یہ دُنیا کا حسین ترین خطّہ ہے۔ میرا پروفیسر کہا کرتا کہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق پر ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لیے یا تو پہاڑ ہونے چاہئیں یا سمندر کا ساحل یا پھر صحرا۔ میدان بالکل بیکار ہیں۔

وہ اداس ہو گیا "یہ علاقہ کبھی علم و فن کا گہوارہ تھا۔ دنیا بھر کو ہم نے جینا سکھایا۔ آرٹ، ادب، رزم، سیاست، ہم ہر بات میں میرِ کارواں تھے۔ لیکن اب اس تیز مشینی دور میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان ملکوں میں اب سوائے افلاس، غلامی اور سیاسی بے چینی کے اور کچھ نہیں رہا۔"

میں نے موضوع بدل دیا اور اسے اپنی سیاحت کے قصّے سُنائے دجلہ و فرات کی وادی پر ہوائی جہاز سے اُڑتے وقت عجیب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو اُوپر سے پرانے شہروں اور نہروں اور سڑکوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ اس اُجاڑ ویرانے میں بھی گنجان آبادی تھی۔ بحیرۂ قلزم سے گزرتے ہوئے میں نے وہ خلیج بھی دیکھی تھی جہاں مدّوجزر سے بڑی نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے تو اس کنارے سے اس کنارے تک ایک پایاب راستہ بن جاتا ہے۔ غالباً اسی جگہ سے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر گزرے ہوں گے۔ پھر فرعون کے گزرتے وقت پانی پرانی سطح پر آ

گیا۔

میں اس علاقے میں بھی رہ چکا تھا۔ جہاں آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت نے تبلیغ شروع کیا۔ وہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ آگ کے بغیر جینا مشکل ہے۔ اس خطّے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مذہب نہیں ہو سکتا لیکن صحرا کے باشندوں سے یہ توقّع رکھنا کہ وہ رات دن آگ جلا کر بیٹھے رہیں زیادتی ہے۔

"لیکن عیسائیت یہاں سے پھیلی اور دنیا بھر نے اسے قبول کیا۔ اگرچہ وہ عیسائی جو مذہب کی پرواہ نہیں کرتے عروج پر ہیں۔ اس لیے کہ روحانیت کی جگہ مادیّت نے لے لی۔ سارے مذہب انسان کو سیدھا رکھنے کے لیے ظہور میں آئے۔ اُسے دہشت ناک چیزوں سے ڈرایا گیا۔ خوشنما چیزوں کا لالچ دیا گیا لیکن اب انسان کو کوئی ڈر ہے نہ لالچ۔ اسی دنیا میں اُسے ہولناک چیزیں بھی مل جاتی ہیں اور طرب ناک بھی۔ دانتے نے دوزخ کی جو تفصیل دی ہے اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ جیل خانوں، ہسپتالوں اور جنگ کے میدان میں ایسے نظارے عام ہیں۔ شاید بہشت کو بیان کرنے کے لیے اسے تخیّل پر زور ڈالنا پڑا ہو۔ لیکن بیسویں صدی میں تو ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں بہشت کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔"

جنوا پر اُسے اترنا تھا۔ کولمبس اسی شہر کا باشندہ تھا۔

"کولمبس کو تو آپ جانتے ہوں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ان کے متعلق سُنا بہت کچھ ہے۔ کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ ویسے میرے جاننے والوں میں سے کئی کولمبس کی طرح ہیں۔ کہیں جا رہے ہوں تو منزل معلوم نہیں ہوتی۔ پہنچ کر یہ خبر نہیں کہ کہاں پہنچے ہیں۔ واپس آ کر یہ علم نہیں کہ کہاں گئے تھے۔"

وہ ہنس پڑا۔

جہاں فرانسیسی ہمیشہ آئن سٹائن کی تھیوری پر غور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اطالوی مُسکراتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے ہیں (یہ گانا صرف دُور سے بھلا معلوم ہوتا ہے)۔ بے تکلّف لوگ ہیں۔ اگر کسی کی ٹائی پسند آ گئی تو اسے ہاتھ سے چھو کر بتائیں گے کہ یہ ٹائی اچھی ہے۔ بڑے اطمینان سے کندھے پر، کہنی یا بازو رکھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ شاید اس توقع پر کہ دوسرا شخص بھی ان کے کندھے پر کہنی ٹیک دے یا غالباً بغلگیر ہو جائے۔ لیکن اگر وہ ان کا ہاتھ ہٹا دے تو بجائے معافی مانگنے کے حیران ہوتے ہیں۔

اطالوی رویرا میں بحیرۂ روم کے خطّے کی آب و ہوا کے جلوے نظر آتے ہیں۔

میرا پروفیسر کہا کرتا کہ "یہ ایسی آب و ہوا ہے جو پندرہ سے ساٹھ سال کے مرد کو سائیٹ لکھنے پر اُکساتی ہے۔ پروفیسر ایّامِ جوانی میں یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ آج کل کے نوجوان کیسے ہو گئے ہیں۔ جب میں جوان تھا تو آس پاس کی سب لڑکیاں شام ہی سے گھروں میں قفل لگا لیا کرتیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایسی چمک آ جاتی کہ میں اپنے دل میں یہ مصرعہ پڑھتا۔ ننگِ پیری ہے جوانی میری۔

فلارنس کے گائیڈ نے جلدی جلدی یہ سبق پڑھ کر سنایا "لارنس ہی ایسا منفرد شہر ہے جس کی خاک سے بے شمار عظیم آدمی اُٹھے۔ دنیا بھر میں یہ فخر سوائے ایتھنز کے کسی اور شہر کو میسّر نہیں ہُوا۔ مائیکل اینجلو، باٹی چیلی، بوکیکیو، دانتے، گلیلیو، بن ونی تو، مشیاولی اور میڈیچی فیملی کے افراد۔ یہاں نشاۃِ ثانیہ نے جنم لیا۔ میڈیچی فیملی نے فن کاروں کی سرپرستی کی۔ یہاں چمڑے اور شیشے کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی میڈیچی فیملی کا ہاتھ ہے۔ اس پُل پر دانتے نے بیترس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ سامنے میڈیچیوں کا مقبرہ ہے۔"

ہمارا امریکن ساتھی ضبط نہ کر سکا۔ "آج یا تو میڈیچی فیملی رہے گی یا میں۔"

اگلے روز گائیڈ ہمیں مائیکل اینجلو کا مجسمہ ڈیوڈ دکھانے لے گیا۔ وہاں سے آرٹ گیلریاں۔

"یہ سب میڈ یچی فیملی کی فیّاضی کا نتیجہ ہے۔" وہ بولا۔

امریکن چلّایا "میڈ یچی فیملی میرے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ خدایا اس فیملی نے میری زندگی تباہ کر دی۔ اپنے وطن پہنچ کر میں راتوں کو ہڑبڑا کر اُٹھوں گا۔ میرے پڑوسی یہ چیخیں سُنیں گے۔ میڈ یچی فیملی میڈ یچی فیملی۔"

فلارنس کے لیے یہ فارمولا استعمال ہو سکتا ہے۔

فلارنس + میڈ یچی فیملی = صفر

فلارنس - میڈ یچی فیملی = ایک خوشنما شہر

کاش کہ وہاں کے گائیڈ اسے استعمال کیا کریں۔

وینس میں ایک موٹر بھی نظر نہیں آتی۔ سڑکوں کی جگہ نہریں ہیں جن میں شکارے چلتے ہیں۔ یہاں کی مال روڈ ایک اچھا خاصا دریا ہے۔ وینس سمندر میں ٹاپوؤں کا ایک جھنڈ ہے جس پر بڑی صنّاعی سے لکڑی اور پتھر بچھا کر مکانوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

سنگِ مرمر کا یہ شہر کبھی عجوبہ روزگار تھا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہاں پہلی ری پبلک وجود میں آئی۔ سب سے پہلا اخبار یہاں جاری ہوا۔ سب سے پہلا پبلشر بھی یہیں آباد تھا۔ ڈاک کا نظام پہلے پہل یہیں سے شروع ہوا۔

یہ رسوائے عالم کیزانووا کا شہر ہے۔ یہاں شیکسپیئر کی ڈیسڈیمونا رہتی تھی۔ اس کا مُور عاشق اوتھیلو (جس کا اصلی نام غالباً عطاء اللہ ہوگا) اس سے ملنے ضرور آتا ہوگا۔

سان مارکو کے چوک میں کوئی ڈیڑھ دو ہزار کبوتر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ کبوتر بڑے بے تکلّف ہیں۔ سر یا کندھے پر اس طرح بیٹھتے ہیں کہ لٹھوں سے پیٹو تو نہیں اُترتے۔

سان مارکو کوئی بہت دور پہنچے ہوئے بزرگ تھے جو شاید شہید ہوئے ہوں گے کیونکہ اس زمانے میں پہنچے ہوئے بزرگوں کے انتقال کا یہی فیشن تھا۔

ڈوگے محل میں وہی پُل ہے جسے بائرن نے آہوں کا پُل کہا ہے۔ لیکن یہ آہیں عاشقوں کی نہ تھیں (جیسا کہ لڑکے لڑکیاں سمجھتے ہیں) بلکہ مجرموں کی تھیں۔

میں ایک جگہ کھڑا سوال نکال رہا تھا کہ اتنے لیروں کے کتنے روپے ہوئے۔ دو لڑکیاں آئیں۔

"آپ نیس میں ہمارے ساتھ تھے۔"

"جی ہاں مجھے یاد ہے۔"

"دو اطالوی ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے کل سے پریشان کر رکھا ہے۔ قریب نہیں آتے بس دُور سے گھورتے رہتے ہیں۔"

"تو اُنہیں بُلا کر لاتا ہوں۔ ابھی تعارف کرا دوں گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "ہم ان سے ملنا تو نہیں چاہتے، بس کسی طرح یہ دفع ہو جائیں۔"

"دکھایئے کہاں ہیں۔"

"وہ رہے۔"

دو پستہ قد لمبے لمبے بالوں والے موٹے تازے نوجوان چوروں کی طرح کھڑے تھے۔

"اب ہم ان کا تعاقب کریں گے۔"

ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ لڑکیوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام سوسن تھا۔ یہ ڈچ تھی۔ دوسری غزالہ (gisele) بیلجیم کی تھی۔ دونوں جنیوا میں اقوامِ متحدّہ کے کسی دفتر میں کام کرتی تھیں۔

"بطورِ غزالہ کے تمہاری آنکھیں ہرن کی سی ہونی چاہئیں اور تمہیں تیز بھاگنا چاہیے۔" ہم نے رفتار تیز کر دی۔ اطالوی فوراً فرار ہو گئے۔

"ہمیں اطالویوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یوں گھورتے ہیں جیسے ابھی کھا جائیں گے۔ تبھی ہم نے رات کو شکارے کی سیر نہیں کی۔ بڑا جی چاہتا ہے لیکن رات کو ڈرتے باہر نہیں نکلتے۔"

"آج شام کو میرے ساتھ چلیے۔"

آٹھ بجے سان مارکو کے چوک میں پہنچا تو وہاں صرف سوسن تھی۔

"غزالہ کہاں ہے؟"

"اس کے سر میں درد ہے۔"

میں سمجھ گیا تین کا ہندسہ اچھا نہیں ہوتا اس لیے غزالہ ریٹائر ہو گئی۔

ہم شکارے میں نکلے۔ رات کا وینس دن کے وینس سے اس قدر مختلف ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ چاندنی میں دُھلی ہوئی عمارتیں، سبزی مائل سمندر، پانی میں روشنیوں کا مچلتا ہوا عکس جیسے لاکھوں ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔

سوسن کو بائرن پسند تھا۔ وہ نظمیں سُنانے لگی۔

"اگر تم مجھے ساتھ نہ لاتے تو میں کبھی یہ چاندنی اور سنگِ مرمر کا طلسم نہ محسوس کر سکتی۔ شاعر، ادیب، صنّاع، معمار، ہر فن کار اپنے دل میں چھپی ہوئی کسک کا اظہار چاہتا ہے۔ جب معمار نے سمندر کی لہروں پر سنگِ مرمر سے مختلف شبیہیں ترتیب دیں تو اس کا پیام وینس کی صورت میں ظاہر ہوا۔"

اگلے دن ہم اکٹھے سیر پر نکلے۔ بڑے گرجے میں طرح طرح کی چیزیں رکھی ہیں۔ یونانی مندروں کے ستون، مسجد کا چھوٹا سا گنبد۔ گائیڈ ہمیں بتا رہا تھا کہ وینس کے باشندے آرٹ کے اتنے دلدادہ تھے کہ جہاں کسی ملک میں کوئی نفیس چیز دیکھتے فوراً وینس بھیج دیتے۔ آرٹ کی خاطر لڑائی یا چوری سے بھی گریز نہ کرتے اور ہر سال یہاں ایک طویل جشن منایا جاتا۔ آٹھ مہینوں تک خوب رنگ رلیاں ہوتیں۔

"بقیہ چار مہینے باشندے کیا کرتے ہوں گے؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"آرٹ کے نمونے چُرانے نکل جاتے تھے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

دوسری شام کو سوسن کے سر میں سخت درد ہوا۔ چنانچہ غزالہ ساتھ گئی۔ اس نے پہلے تو بائرن کی شان میں گستاخانہ جُملے کہے کہ اطالویوں کی طرح تعاقب کیا کرتا اور شادی شدہ خواتین کے پیچھے تو تیر کی طرح جاتا تھا۔ پھر یہ خوشخبری سنائی کہ

وینس کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ لکڑی گل چکی ہے۔ پُل ہلتے ہیں۔ مکان آہستہ آہستہ بیٹھ رہے ہیں۔ یہ شہر سخت خطرے میں ہے۔

''دو تین دنوں تک تو شہر تباہ نہیں ہو رہا؟ میں پرسوں جا رہا ہوں۔''

''نہیں ابھی کئی سال لگیں گے۔ پتہ نہیں اطالوی اپنے شہروں کا ذکر کرتے وقت مرنے کا حوالہ کیوں دیتے ہیں۔ فلارنس دیکھئے اور مر جایئے۔ نیپلز دیکھ کر مریئے۔ میرے خیال میں اس شہر کے لیے یہ فقرہ ہونا چاہیے۔ وینس سونگھئے اور مر جایئے۔''

کشتی چلانے والے کو جو ترنگ آئی تو اس نے گانا شروع کر دیا۔ اس کا مُنہ میرے دہنے کان سے تقریباً بارہ انچ کے فاصلے پر تھا لہٰذا فوراً سگریٹ دے کر چُپ کرایا۔

دو سگریٹوں کے بعد بھی جب وہ باز نہ آیا تو میں نے غزالہ سے جگہ بدل لی۔

روم میں جگہ جگہ رومیو ملتے ہیں۔

کلیسائے پطرس روم میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ اسٹیشن روم کا لگتا ہے لیکن ڈاک خانہ واٹیکن کا ہے۔ واٹیکن تیرہ ایکٹر جگہ کا نام ہے جو خود مختار ہے اور بیش قیمت

تحائف سے پٹا پڑا ہے۔ یورپ بھر کے شاہی مرید اپنے پیرِ اعلیٰ یعنی پوپ کو بڑی قیمتی چیزیں بھیجتے رہے ہیں۔ سیّاح اکثر سوچتے کہ اگر اطالوی اپنے گرجوں سے سونے چاندی کے یہ تحفے نکال لیں تو اٹلی کا افلاس آج دُور ہو سکتا ہے۔

کولوزیم ایک قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے یہاں کتنے انسانوں کا خون بہا ہو گا۔ لیکن رات کو یہ جگہ اور طرح کی معلوم ہوتی ہے۔ گمان تک نہیں ہوتا کہ کبھی یہاں لاکھوں خون کے پیاسے تماشائی جمع ہوتے ہوں گے اور جان لیوا مقابلوں میں شریک ہونے والوں کی یہ پکار اس عمارت میں گونجتی ہو گی۔ ”اے شہنشاہ! ہم جو کہ بہت جلد مرنے والے ہیں تجھے سلام کرتے ہیں۔“

سات پہاڑیوں کا پُرانا روم تباہ ہو چکا ہے۔ کہیں کہیں کھنڈر رہ گئے ہیں۔ موجودہ شہر زیادہ پرانا نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے۔ ہر تاریخی عمارت کے ساتھ دو مذہبی میوزیم اور چھ گرجے بھی زبردستی دیکھنے پڑتے ہیں۔

وہ میز اب بھی رکھی ہے جس پر حضرت عیسیٰ نے آخری کھانا کھایا۔ وہ سیڑھیاں بھی ہیں جن کو طے کر کے وہ صلیب تک پہنچے۔ لوگ ان سیڑھیوں پر گھٹنوں کے بل چڑھتے ہیں اور دیکھنے والا ڈرتا رہتا ہے کہ یہ اب گرے اب گرے۔

اٹلی کو اپنے آرٹ پر سدا فخر رہا ہے۔ دنیا کی تخلیق، نقّاشی کی زبردست مثال

ہے۔ مائیکل اینجلو نے حضرت آدم و حوا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی تصویر بھی بنائی ہے۔

واٹیکن میں متبرّک چیزوں کے علاوہ برہنہ مجسمے بھی ملتے ہیں۔ برہنہ تصویریں اور مجسمے بنانا بڑا مشکل کام سمجھا جاتا تھا۔ انہیں وہی آرٹسٹ بنا سکتے تھے جو علم الابدان کے ماہر ہوں، جو اس علم سے ناواقف تھے وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انہیں کپڑے پہناتے تھے۔

تین دن تک میں گائیڈوں سے بچتا رہا۔ پیازہ وینسیا میں کھڑا تھا کہ ایک گائیڈ نے مجھے آلیا۔

”وہ دیکھئے۔ اس بالکنی سے مسولینی ہجوم کو مخاطب کیا کرتا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”جب ہٹلر روم میں آیا تو بجلی کا ایک لیمپ بھی نہ جلا۔ لوگ مشعلیں ہاتھ میں لیے پھر رہے تھے۔ سارا شہر تاریک تھا۔ صرف مشعلوں کی روشنی تھی۔ ایسی رات پھر کبھی نہ آئے گی۔“

”روم میں کیا کسی شہر میں نہ آئے گی۔ سوائے ایڈنبرا کے۔“

"جولائی کا مہینہ جولیس سیزر کے نام پر ہے۔"

"اور اگست شہنشاہ آگسٹس کے نام پر۔"

اگلی صبح اُٹھا تو میری توبہ ٹوٹ چکی تھی۔ میں دوسرے سیّاحوں کے ساتھ بس میں بیٹھا ہوا تھا اور گائیڈ ہمیں ہدایات دے رہا تھا۔ ایک جگہ بس رُکی۔

"اُتریئے! گائیڈ نے ہمیں حکم دیا۔"

ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے امریکن نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "اب یہ کیا دکھائے گا؟"

"حضرت موسیٰ۔" وہ بولی۔

بوڑھے نے کھڑکی سے ڈیڑھ دو سو سیڑھیاں دیکھیں جنہیں ہم سب کو طے کرنا تھا اور سگار کا کش لگا کر بولا "تم دیکھ آؤ۔ میرے خیال میں حضرت موسیٰ کے بغیر میرا گزارہ ہو سکتا ہے۔"

نیپلز کے اسٹیشن پر کمولا منتظر ملا۔ بازو پھیلائے ہوئے آیا اور مشرقی انداز میں لپٹ گیا۔

"امی کو امی کو (میرے عزیز دوست)۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دورانِ جنگ میں وہ اطالوی فوج میں تھا۔ افریقہ کے صحرا میں گرفتار ہوا۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا علاج کیا۔ پھر اتّفاق سے میرا تبادلہ قیدیوں کے کیمپ کے ہسپتال میں ہو گیا جہاں وہ بھی تھا۔ اس سے دوستی ہو گئی۔ جنگ کے بعد اس نے اٹلی سے خط و کتابت جاری رکھی۔ نیپلز پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاؤنٹ ہے۔ نصف سے زیادہ شہر کا مالک ہے۔

اس نے ایسی خاطر مدارت کی کہ الف لیلہ کی راتیں یاد آگئیں۔ جنّوں اور پریوں پر دوبارہ اعتقاد ہو گیا۔ نیپلز کی خوشنما خلیج کے کنارے چاندنی رات میں ایک مشہور فنکار نے پیانو پر مون لائٹ سوناٹا بجایا۔ آدھی رات تک بادبان والی کشتیوں میں سمندر کی سیر ہوتی، پھر محفلِ رقص و سرود جمتی۔ رات کو تین بجے سو کر صبح اٹھتا تو بالکل وہی بیزار موڈ ہوتا جو علی الصبح شوپنہار کا ہوتا ہو گا۔ ضیافتوں پر مجھے اطالوی لڑکیوں سے ملایا جاتا۔

ایک لڑکی کا نام MARISA تھا۔ میں نے کمولا کے کان میں کہا "تم اتنے دن مشرق میں رہے اور مریضہ کے معنی نہ آئے۔ یہ لفظ بیماروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

دوسری سے متعارف ہوا۔ روزالبا۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تھا۔

"اس کے معنے تو ٹھیک ہیں نا؟" کمولا نے کان میں پوچھا۔

ایک نہایت مرنج مرنجاں اور بیزار قسم کا آدمی ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم رقص کر رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ہم پر تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اُلجھن ہونے لگی۔

"کون ہے یہ؟"

"روزالبا کا منگیتر، تم اس کی ذرا پروانہ کرو۔ یہ ہمیشہ یونہی رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔ روزالبا اسے جوتے کی نوک پر نہیں لیتی۔"

وہ کاؤنٹس سے پوچھ رہی تھی کہ میرا قیام کتنا ہے۔ پانچ چھ روز سُن کر اس نے افسوس میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ بھلا پانچ چھ دنوں میں کیا ہو سکتا ہے۔

کمولا، کاؤنٹس، روزالبا اور میں چاروں اگلے روز باہر گئے۔ وسوویس پہاڑ کے دامن میں میرے دوست نے موٹر ٹھہرائی اور ہمیں دو بندوقیں دیں۔

"یہ کس لیے ہیں؟ ان سے ہم ایک دوسرے کو کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"روزالبا کو کبوتر کے شکار کا شوق ہے۔ جنگل میں جا کر شکار کھیلو۔ شام کو میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

میں نے بہتیرا کہا کہ بھلا اطالوی کبوتروں نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ میں انہیں کُچھ کہوں۔ لیکن وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ وہ میرے وطن کے متعلق سوال پوچھنے لگی۔ میں نے پاسپورٹ نکال کر دے دیا کہ اس میں سب کچھ لکھا ہے پڑھ لو۔ تصویر دیکھتے ہی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"تم جنگ میں لڑے تھے؟"

"ہاں"

"تم نے کتنے اطالوی مارے؟"

"چھ سات تو گنے تھے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ نہیں۔"

غصّے سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"تم لڑنا چاہتی ہو۔ یہ رہی بندوق۔ ورنہ تمہارا غصّہ اس غریب منگیتر پر اُترے گا۔"

مُنہ پھیر کر وہ دُور جا بیٹھی۔

"اے وطن پرست حسینہ! پاسپورٹ کا دوسرا صفحہ بھی پڑھ۔ ڈاکٹر ہلاک نہیں کیا کرتے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ علم ہوتا کہ یہاں کی لڑکیاں

ایسی خونخوار ہیں تو کبھی اطالویوں کو نہ چھوڑتا۔"

"مجھے معاف کرو۔ میرا منگیتر جنگ میں مارا گیا تھا۔"

"تمہارے کتنے منگیتر ہیں؟"

"اصلی منگیتر وہی تھا۔"

"تو گویا اسسٹنٹ منگیتر ہے۔"

وہ مُسکرانے لگی۔

"لیکن جنگ کو تم نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔"

"غالباً تم صحیح کہتے ہو۔ ہم آرٹسٹ ہیں، سپاہی نہیں۔ اس جنگ میں ہمارے ہاں دو فریق تھے۔ رجائی اور قنوطی۔ رجائی کہتے تھے ہم یہ جنگ ضرور ہاریں گے۔ قنوطی کہتے، درست ہے مگر کب؟"

ہم سرو کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ خوشگوار دھوپ میں ساری وادی نِتھری ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ سامنے نیلا سمندر تھا۔

"بارش تو نہیں ہو رہی جو برساتی پہن رکھی ہے۔"

"شاید ہونے لگے۔ میں قنوطی فریق سے ہوں۔"

"تم اسے ہر وقت ساتھ رکھتے ہو؟"

"اسی کو سیر کرانے کے لیے تو میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تم نے گونج سُنی؟" میں بظاہر چوکنا ہو گیا۔

"نہیں تو۔" وہ ڈر گئی۔

"یہ وسوویس کی گڑگڑاہٹ تھی۔ ابھی پہاڑ پھٹے گا اور لاوا بہنے لگے گا۔ وہ دیکھو ایک آدمی بھاگا جارہا ہے۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم تو کبوتروں کا شکار کرتی ہو۔ ایک معمولی سے پہاڑ کی کیا وقعت ہے۔ ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے۔"

کافی دیر کے بعد اسے یقین آیا کہ گونج اور کچھ نہ تھی۔ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ سورج ڈوبنے لگا تو آسمان سُرخ ہو گیا۔

اس نے برساتی پر اپنے نام کے پہلے حروف لکھے۔ "جب انہیں دیکھو گے تو روزالبا یاد آجائے گی۔"

کمولا بہت دیر میں آیا۔ مجھے چھیڑنے لگا۔ ”اسے کیونکر رام کیا۔ یہ تو بے حد غصیلی اور گستاخ لڑکی ہے۔“

”یہ سب بزرگوں کی دعا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

رات کو میں نے خواب دیکھا کہ سامنے روزالبا کھڑی ہے۔ متناسب جسم، شگفتہ حسین چہرہ اور دلآویز مُسکراہٹ۔ پھر جیسے اُس کا حجم بڑھنے لگا۔ بازو پھُولتے گئے۔ گردن غائب ہو گئی۔ ایک ٹھوڑی کی جگہ دو ہو گئیں۔ وہ پھیلتی گئی حتیٰ کہ میٹرن معلوم ہونے لگی۔

صبح کمولا سے پوچھا۔ وہ بولا ”یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اطالوی سینوریتا کے پاس سب کچھ ہے۔ حُسن، تمازت اور کشش۔ لیکن ان پر فربہی بہت جلد آتی ہے۔ شاید یہ زیتون کے تیل کا اثر ہے یا آرام پسند زندگی کا۔“

میں نے اُسے بتایا کہ یہاں کھانا بہت لذیذ ہے۔ سات کورس کا ڈِنر۔ اس کے بعد بیرا چپکے سے پوچھتا ہے۔ ”کچھ اور لاؤں؟“ لیکن شہروں کے باہر بڑی غربت ہے۔ ”ہم لوگ مفلس ہیں۔ ہمارے ہاں اتنی بھوک ہے پھر بھی عورتوں کی فربہی جوں کی توں ہے۔“

”افلاس کے لیے حکومت کچھ نہیں کرتی؟“ میں نے پوچھا۔

"کون سی حکومت؟ ہر مہینے تو یہاں حکومت بدلتی ہے۔ فرانس کی طرح ہم بھی بار بار حکومت تبدیل کرتے ہیں تاکہ ہر شخص کو موقع مِل سکے اور ری پبلک کے معنی ہر خاص و عام پر واضح ہو جائیں۔ ہماری کرنسی کی کوئی قدر نہیں۔ پاؤنڈ کے بیس پچیس لیرے ہُوا کرتے تھے۔ اب سترہ سو ہیں۔ بجائے بٹوے کے لوگ کلپ میں نوٹوں کو دبا کر رکھتے ہیں۔"

لیروں کے ذکر پر مجھے کچھ تحفے یاد آ گئے جنہیں خریدنا چاہتا تھا لیکن اپنے دوست کے سامنے خریدتے ہچکچاہٹ ہوتی تھی کیونکہ وہ قیمت خود ادا کر دیتا۔

بہانہ کر کے میں دکان میں گھُس گیا۔ باہر نکلتے وقت شاید دوسری گلی میں چلا گیا اور راستہ بھول گیا۔ پھر کمولا کی آواز سنائی دی۔

"تم نے اتنی دُور سے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا؟"

"اطالویوں کے ہجوم میں تمہارا چہرہ اور کندھے دُور سے نظر آ جاتے ہیں۔ تم سوچتے تو ہو گے کہ یہ خوش باش اور آرام طلب قوم عظیم رومنز کی اولاد کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ رومن جو کبھی دنیا کے مالک تھے۔ مسولینی کو وہم تھا یا خوش فہمی، وہ ہمیں پرانے رومن سمجھتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک انسان چند لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لیے بیوقوف بنا سکتا ہے لیکن سب کو زیادہ دیر تک نہیں۔"

اب ہمارا مقولہ ہے ڈولچی فی آرے نی انتے (کچھ نہ کرنا کِس قدر خوشگوار ہے)

مجھے ایک مصرعہ یاد آ گیا۔ ع جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔ شاید ہم بھی اسی سنہرے اصول پر کاربند ہیں۔

"یہ تم بیٹھے بٹھائے فلاسفر کیوں بن گئے؟" میں نے کہا "آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں۔"

پامپیائی حضرت عیسٰے کی پیدائش سے پہلے سمندر کے کنارے آباد تھا۔ ایک رات وسوویس پھٹا۔ یہ شہر اور ہرکونیم دونوں لاوے میں دب گئے۔ پہیہ اور سپرنگ دورِ جدید کے دو سب سے اہم آلے سمجھے گئے ہیں۔ پامپیائی میں استعمال ہوتے تھے۔ نئی عمارتوں میں دوسری گرمی کے بچاؤ کے لیے دوہری دیواروں کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ پامپیائی میں دیواریں دوہری ہیں۔ ان میں پائپ لگے ہوئے ہیں اور سائفن بھی۔

پتھر کی سڑکوں پر رَتھ کے پہیّوں کے نشان ہیں۔ ریل کی لائنوں کا عرض ان سے لیا گیا ہے۔ چونکہ اس شہر کو لاوے نے تباہ کیا تھا انسان نے نہیں اس لیے کھدائی میں سب کُچھ جوں کا توں ملا۔ دیواروں پر الیکشن کے اشتہار ہیں۔ فلاں کو ووٹ دیجئے۔

اس فقرے کو مخالف پارٹی نے کاٹ کر نیچے لکھ دیا ہے، جن کی جگہ فلاں صاحب کو ووٹ دیجیئے۔ مکانوں پر خوش آمدید۔ کتّے سے خبر دار رہیئے۔ یہاں پارک کرنا منع ہے اور دیگر نوٹس ہیں۔ ہسپتال کے قریب کی سڑکیں رَتھوں کے لیے بند ہیں۔

شیشے کے برتن، سونے کے زیورات، جرّاحی کے نازک آلے ڈھائی ہزار سال سے حالات کُچھ زیادہ نہیں بدلے۔

رات کی ضیافت نائٹ کلب میں ہوتی ہے۔ کمولا مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ یکایک ایک شعلہ سالپکا اور نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ کمولا اُسے لینے گیا لیکن وہ مُڑی اور دوسرے گروہ میں شامل ہو گئی جہاں کسی اور کی پارٹی ہو رہی تھی۔

یہ گراتسی آلدہ تھی یعنی فیاض اور مہربان۔

غیض و غضب سے کمولا کانپ رہا تھا۔ اطالوی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ ”میری زبردست توہین ہوئی ہے۔ اسے میں نے بلایا تھا لیکن مخالف فریق نے ہتھیا لیا۔ ان میں میرا پرانا دشمن بیٹھا ہے جس نے دانستہ طور پر مجھے زِک پہنچائی ہے۔“

”نہیں آئی تو نہ سہی۔ لعنت بھیجو پرانے دشمنوں پر“

"نہیں! وہ مَردود اس لڑکی پر عاشق ہے۔ اٹلی کا ہر مالدار شخص اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میرے عزیز دوست ایک کام کرو۔ کسی طرح اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔" میں نے سوچا کہ ہماری تاریخ میں کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ بھرے سوئمبر سے کوئی سورما لڑکی کو بھگا لے گیا اور لوگ مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ بعد میں تو لڑکیوں اور سورماؤں کو عادت سی پڑ گئی تھی۔ اگر کوئی سوئمبر خیریت سے تمام ہوتا تو لڑکی اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتی۔

کمولا اصرار کرنے لگا۔ میں ہال عبور کر کے دوسرے گروہ میں پہنچا اور گراتسی آلدہ کو رقص کے لیے کہا۔ وہ مُسکرا کر اُٹھی۔ رقص کے اختتام پر میں اسے چھوڑ آیا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا۔ تیسری دفعہ بھی اسی کے ساتھ ناچا۔ چوتھی مرتبہ جب رقص ختم ہوا تو میں نے اس کا بازو تھام لیا۔

"چلیے، کمولا منتظر ہے۔"

"لیکن وہ؟" گراتسی آلدہ نے ایک پلے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ جائے جہنم میں۔ آپ ہماری مہمان ہیں۔"

اس کے آتشیں ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تڑپتی مچلتی حسینہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا فربہ

آدمی تیزی سے ہماری طرف آیا اور گراتی آلدہ سے کچھ کہنے لگا۔:

"آپ مجھ سے گفتگو کیجئے۔ خاتون میرے ساتھ ہیں۔" میں نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

مکمّل خاموشی چھا گئی۔ ہجوم کی نگاہیں ہم تینوں پر تھیں۔

وہ بڑی تیزی سے بولنے لگا۔ اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے میں نے جھٹک دیا۔

"آپ مجھ سے بات کیجیے۔" میں آگے بڑھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سر اوپر اٹھا کر قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر سوچ کر واپس چلا گیا۔

"میرے دوست! تم نے آج میری آبرو رکھ لی۔" کمولا مجھ سے لپٹ گیا۔ "سارے نیپلز کے سامنے میں نے اسے شکست فاش دی ہے۔"

محض اغیار کے سینوں پر مونگ دلنے کے سلسلے میں مَیں نے بار بار گراتسی آلدہ کے ساتھ رقص کیا۔

کھانے کے بعد کمولا میرے کان میں بولا۔ "یہ تمہارے ساتھ سورنتو کی سیر کرنا

چاہتی ہے۔"

"کب"

"اسی وقت"

"دوست تم مجھے مخمصوں میں پھنساتے ہو۔ ابھی اس آدمی سے لڑائی ہوتے ہوتے بچی ہے۔ کون تھا وہ؟"

"یہ Fiat کمپنی کا ڈائریکٹر ہے۔"

وطن میں تین برس تک میں نے Fiat کار چلائی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ابھی اپنی کار کے صنّاع سے لڑنے لگا تھا۔

"مگر میں یہاں تم سے ملنے آیا ہوں نہ کہ لڑکیوں کی ایک پلٹن سے۔"

"ضد نہ کرو۔ یہ رہی کار کی چابی۔"

بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ نیلے سمندر میں زرد، سُرخ، سبز، گلابی روشنیوں کے عکس اتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے کہ کچھ دیر کے لیے میں ساتھ بیٹھی ہوئی گراتسی آلدہ کو بھول گیا۔ میرے ذہن میں وہ کہانیاں پھر رہی تھیں جو سورنتو راویلّو، املفی سے وابستہ ہیں۔ کار ٹھہرا کر ہم ایک

اُونچی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔

"تم خوب جانتی ہو کہ بے حد حسین ہو۔ پھر یہ عشوے اور غمزے کس لیے؟"

"مجھے مضبوط اور پُر وقار مرد پسند ہیں۔ تمہاری جرأت پہلے تو بُری لگی، پھر میں نے اسے سراہا۔ اپنے اوپر تمہیں کس قدر بھروسہ ہے۔ لیکن تمہارے دوست کو اتنی ہمت کیوں نہ ہوئی؟"

"اپنے دوست کے خلاف میں ایک لفظ سُننا نہیں چاہتا۔"

اس نے بازو اُٹھا کر انگڑائی لی۔ سیاہ زلفوں کی ایک لٹ ماتھے پر آن پڑی۔ دو ساحر آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے سُنا ہے کہ تمہارے حسن میں ایسا جادو ہے کہ لوگ دم تھام کر رہ جاتے ہیں لیکن تم کسی کو قریب نہیں آنے دیتیں۔ سب کو ترساتی ہو۔"

"نہ جانے کیوں مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ جس مرد کو چاہو غلام بنالو۔ یہ کیسا مخمور کُن خیال ہے۔ ذرا سی مُسکراہٹ، پیار بھرا بول، معمولی سی ادا سے مردیوں شل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیسے ان پر بجلی آن گری ہو۔ کتنی خود اعتمادی محسوس ہوتی ہے کہ جیسے ان کی قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہو۔ بس اشاروں پر ناچنے

لگتے ہیں۔ شکار کو گھیر کر شکاری بھی تو یہی محسوس کرتا ہے۔"

"تو مجھے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ان مردوں میں سے نہیں ہو جن کے دل میں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔"

"مگر وقعت ہونی چاہیے۔ عورت ایک بے بس ناسمجھ بچّے پر اپنی زندگی ضائع کر کے اسے مرد بناتی ہے۔ کُنبے کی پرورش میں عورت کا کردار نہایت اہم ہے۔ تخلیق و تربیت میں اس کے فرائض بڑے کٹھن ہیں۔ مرد کی حیثیت ایک آنریری ممبر کی سی ہے۔ چنانچہ یہ مرد ہی ہے جو جنگیں کرتا ہے۔ نئے اُفق تلاش کرتا ہے۔ اُونچے پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ نئ نئ ایجادات، نت نئے کارنامے، ادب، شاعری، سیاست، سب مرد کے ہیں۔ اس لیے کہ وہ آزاد ہے اور اس کے پاس زیادہ وقت ہے۔"

"سُنا ہے تمہارے ملک میں پردے کا رواج ہے۔"

"ہاں"

"مجھے پردہ بہت پسند ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا اپنے

بندوں سے پردہ کرتا ہے۔ مغرب میں عورت اپنا وقار کھو چکی ہے۔ اسے معاشی آزادی میسّر ہے۔ وہ فیکٹریوں دفتروں اور دکانوں میں کام کرتی ہے لیکن اب اس کا گھر نہیں ہے۔ اٹلی کو مذہب لے کر بیٹھ گیا ہے۔ یہ مذہب طلاق کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جس کا جو جی چاہے کرتا ہے۔ کوئی باز پُرس کرے تو اسے بھی ترغیب دیتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کرو۔ ان دنوں میرے پیچھے بے شمار شادی شُدہ مرد لگے ہوئے ہیں۔ ایک دن تمہارا دوست۔"

"میرے دوست کو بیچ میں مت لاؤ اور یہ بتاؤ کہ سحر طرازی کا یہ پروگرام کب تک جاری رہے گا؟"

"میں پچیس برس کی ہوں۔ شاید پندرہ برس اور حسین رہوں۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح رہا کروں گی۔"

"اچھا تو میں سولہ برس کے بعد تم سے مِلوں گا۔ تب تک خطرہ دور ہو چکا ہو گا۔"

"اگر اگلے سال میں تاجپوشی دیکھنے لندن آئی تو تم ملو گے؟"

"مِلوں گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ میں مزدور آدمی ہوں۔ اب چھٹی ہے تب کام ہو گا۔"

اس نے پھر انگڑائی لی اور اُف کہہ کر کلائی تھام لی۔

"کیا ہوا؟"

"چوڑی ٹوٹ گئی۔ خون نکل آیا۔"

برساتی پر خون کے دو قطرے گر گئے جنہیں رومال سے پونچھا مگر نشان نہ گیا۔ اس نے برساتی پر وہ حروف نہ جانے کیسے پڑھ لئے۔ مچل گئی۔ "یہ اُس ڈائن روزالبا نے لکھا ہے۔"

پتھر سے حروف کھُرچنے لگی۔ بڑی مشکلوں سے اُسے منایا۔

شہنشاہ ٹائبیریس نے دنیا پر حکومت کرنے کے لیے کیپری کو صدر مقام چُنا تھا۔ اس کا انتخاب غلط نہ تھا۔ کیپری دنیا کا سب سے خوشنما جزیرہ ہے۔ ایک نیلی سی دُھند یہاں ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ کوئی رنگ ایسا نہیں جو یہاں نہ ہو۔ سمندر کا رنگ پہاڑوں کا رنگ، آسمان کا رنگ، باغ، عمارتیں، پھول، لباس ہر چیز رنگین ہے۔

سب سے حسین بلیو گراتو (نیلا غار) ہے جس کا واحد راستہ سمندر سے ہے اور اتنا

تنگ ہے کہ کشتی میں لیٹ کر داخل ہوتے ہیں۔ غار کے مُنہ سے روشنی اندر آتی ہے جو نیلے پانی سے گزرتے ہوئے رنگی جاتی ہے۔ اندھیرے میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بہت بڑا نیلم جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ لوگ مبہوت رہ جاتے ہیں۔ کشتیاں بار بار ٹکراتی ہیں۔ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ ملّاح کھینچ کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔

ہم واپس نیپلز جارہے تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ "ٹھہرو!" اس نے بالکل اس طرح نعرہ لگایا جیسے ہماری فلموں میں ایک آدمی ہمیشہ پکارتا ہے "ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہوسکتی۔"

اس کے ہاتھ میں کوئی سبز چیز تھی۔۔۔ میری برساتی۔

اچھی جگہوں پر یہ خود بخود رہ جاتی ہے۔ یا تو شرارتی ہوگئی ہے یا اسے سکاٹ لینڈ کی آب و ہوا پسند نہیں۔

رات کی محفل میں گانا بجانا خوب زوروں پر تھا کہ ایک ادھیڑ عُمر کا شخص اپنے سیاہ لباس پر امتیازی نشان لگائے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"معاف کیجئے۔ سینورا آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے۔"

میں اب اس قسم کی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔

"چلئے۔" میں اُٹھ کر ساتھ ساتھ ہو لیا۔

سامنے ایک نوعمر لڑکی ہیرے جواہرات پہنے مُسکرا رہی تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو خاوند غائب تھا۔

میں اور وہ اکیلے رہ گئے۔ وہ سِسلی سے آئی تھی اور انگریزی نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ چھوٹے موٹے الفاظ کے علاوہ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

وہ بے حد خوبصورت تھی۔ رخسار پر ننھا سا تل تھا اور چہرے پر بلا کی معصومیت۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے، گلے میں بیش قیمت ہار، سر پر جڑاؤ TIARA۔ بار بار وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی لیکن شدھ اطالوی زبان میں۔ ویسے جب اطالوی باتیں کرتے ہیں تو ان کے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ حسین لڑکی نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی میں صرف اتنا سمجھ سکا۔ آج رات گیارہ بجے۔ پاپیائی کی سڑک۔

کمولا مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا رائے دے گا۔

اس کا خاوند کافی دیر کے بعد آیا۔ چلتے وقت اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا

کہہ رہی ہو۔ بھُولنا مت۔ ضرور آنا۔

پونے گیارہ بجے میں نے برساتی اوڑھی۔ کمولا کی کار لے کر پاپیاآئی کی طرف چل دیا۔ لیکن سوچ رہا تھا جاؤں یا نہ جاؤں۔ برساتی کی طرف دیکھا۔ اس کے کالر لٹک رہے تھے۔ سلوٹیں سی پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے برساتی خوش نہیں ہے۔ بلکہ کہہ رہی ہے کہ میاں تم سیّاح ہو ان اُلجھنوں میں مت پڑو۔ سب کچھ دُور دُور سے دیکھو اور اپنا راستہ لو۔

اچھا نہیں جاتا۔ میں واپس لوٹ آیا۔

نیپلز سے روانگی کے وقت کمولا کہنے لگا۔ ”اگلی مرتبہ زیادہ چھٹّی لے کر آنا۔ ہم دونوں سِسلی چلیں گے۔“ گاڑی کی گھنٹی بجی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

”اَمی گو۔۔ پھر ضرور آنا۔“

سوئٹزرلینڈ کو یورپ کی تفریح گاہ کہتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کونسی تفریح؟

یہاں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ رنگ برنگے پھُول ہیں۔ وسیع سر سبز

وادیاں، نیلی جھیلیں، سب کچھ ہے مگر یہ نظارے اپنے آپ کو اس باقاعدگی سے دہراتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کے تیس چالیس میل دیکھ لینا سارا ملک دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

یہاں اصلی سوِس بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ملک کے تین حصّے ہیں۔ جنوبی حصّے میں یہ معلوم ہوتا ہے گویا ابھی تک اٹلی ہی میں قیام ہے۔ شمالی حصّے میں جرمنی اور مغربی حصّے میں فرانس یاد آتے ہیں۔ (مشرقی حصّے میں کچھ یاد نہیں آتا)۔ یہاں ایک چیز سے بھر جاتا ہے۔ ایک دکان میں بلّی دیدے مٹکا رہی ہے۔ یہ گھڑی ہے۔ ایک جگہ چوہاناچ رہا ہے۔ یہ بھی گھڑی ہے۔ وہ چیز جو قلمدان معلوم ہوتی ہے۔ دراصل گھڑی ہے۔ ہر جگہ گھڑیاں ہی گھڑیاں ہیں۔ لمبوتری، مخروطی، مستطیل، مربع، گول، تکونی اپنی گھڑی سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اونچے الپس گھٹاؤں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ وادیوں میں دھوپ رہتی ہے لیکن گھٹا اندر آجائے تو یہ پہاڑ باہر نہیں نکلنے دیتے۔ چنانچہ ہفتوں بارش ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں ان فلک بوس پہاڑوں کو ہینی بال نے ایک کثیر فوج اور سینتیس ہاتھیوں سمیت عبور کیا تھا۔ اٹلی پہنچ کر اس نے فوج گنی تو معلوم ہوا کہ دشوار

گزار راستوں میں ہزاروں سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن ہاتھی پورے سینتیس موجود تھے۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ ہینی بال بذاتِ خود ہاتھی پر سوار تھا لہٰذا ہاتھیوں کے طفیل سے بچ گیا۔

لوسرن سے جھیل عبور کر کے پہاڑی ریل کے ذریعے رِگی کی چوٹی پر پہنچا۔ دیر تک تصویریں اُتارتا رہا۔ ہوٹل پہنچ کر معلوم ہُوا کہ برساتی پھر غائب ہے۔ مجھے کچھ اپنے اوپر غصّہ آرہا تھا۔ کچھ برساتی پر۔ اسے یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔

اگن بوٹ والوں سے ملا۔ اُنہوں نے پہاڑی ریل کے چھوٹے سے اسٹیشن کو فون کیا کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو اونچا سا درخت ہے اس کے نیچے ایک برساتی پڑی ہو گی۔ جواب آیا۔ برساتی بالکل وہیں رکھی ہے، تہہ کی ہوئی۔

ٹرین چلنے سے دس منٹ پہلے ایک آدمی برساتی لے کر اسٹیشن پر پہنچا۔ "جناب بہت اچھا ہوا کہ یہ مل گئی ورنہ آپ یہی سمجھتے کہ سوئٹزرلینڈ والوں نے چُرالی۔"

لندن پہنچا۔ اگلے روز ملکہ کی گارڈن پارٹی پر مدعو تھا۔ ایک پرانے افسرِ اعلیٰ نے ملکہ اور ڈیوک سے ملایا جنہوں نے وطن اور عزیزوں کے متعلق باتیں کیں۔

جب میں جولیا کو روم کے گرجوں کی باتیں سُنا رہا تھا تو وہ بار بار پوچھتی۔ "مگر ملکہ نے اور کیا کیا سوال کیے؟ شہزادی مارگریٹ کا لباس کیسا تھا؟ ڈریوک کیسے معلوم

ہو رہے تھے؟"

ایڈنبرا میں لڑکے لڑکیوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا کہ وہ مختصر سی گفتگو جو شاہی خاندان کے افراد سے ہوئی تھی مجھے مہینوں دُہرانی پڑی۔ لیکن جولیا کو میں نے روم کی ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ اس کے عقیدے ڈگمگانے لگے اور آخر اس نے مذہب تبدیل کر لیا وہ رومن کیتھولک سے پروٹسٹنٹ بن گئی۔

میں چونکا۔ گھڑی دیکھی اُفّوہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی بہت سفر باقی ہے۔ دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ چھ بجے ہی اندھیرا ہو جائے گا۔ اب اُٹھیئے۔ اُٹھیئے۔ بس اب کہ لذّت خواب سحر گئی۔ جاگتے میں خواب دیکھنا بہت بُری عادت ہے۔ قصّہ سوتے جاگتے کا تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کل نو بجے لندن میں آپ کا پہلا لیکچر ہے۔ پانچ بجے تک کلاسیں ہوا کریں گی۔ رات کو آموختہ یاد کیجیئے گا اور پانچ چھ گھنٹے سو کر ۔رات گزری، نور کا تڑکا ہوا، ہوشیار! اسکول کا لڑکا ہوا۔ میں برساتی لے کر اُٹھا اور کار میں بیٹھ گیا۔

دس پندرہ میل گیا ہوں گا کہ ایک شخص نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں رُک گیا۔

"کہاں چلو گے؟"

"جہاں لے چلو۔"

"لندن؟"

"ہاں"

میں نے اُسے بٹھالیا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ عقابی آنکھیں، ورزشی جسم، مُسکراتا چہرہ، اس کے پاس صرف ایک چمڑے کا صندوق تھا۔

"یہ صندوق سامان کے ساتھ رکھ دیں؟" میں نے پوچھا

"نہیں۔ اسے میں اپنی گود میں رکھ لوں گا۔"

صندوق پر بیشمار لیبل لگے ہوئے تھے۔ وی آنا، زیورچ، برلن، کوپن ہیگن، فرینکفرٹ۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام جیرلڈ ہے۔ کینیڈا کا رہنے والا ہے۔ پچھلی جنگ میں ہوا باز تھا۔ قریب ہی ایک کیمپ میں ایک ماہ کے لیے ہوا بازی کی ٹریننگ کے واسطے آیا تھا۔ اب ملازمت کی تلاش میں لندن جارہا ہے۔

"کینیڈا میں آٹھ برس سے نہیں گیا۔ وہاں تھوڑی سی زمین ہے۔ اس کی آمدنی پر گزارا ہے۔"

"تو زر، زمین، زن میں سے تمہارے پاس ایک چیز موجود ہے۔"

میں نے کہاوت کا ترجمہ کیا تو وہ ہنسنے لگا۔ "یوں تو زن بھی تھوڑی سی ہے۔ ایک

لڑکی مجھے پسند ہے اور تم؟“

”میں ان تینوں سے مُبرّا ہوں۔“

میں اس کے صندوق کے لیبلوں کو پھر دیکھنے لگا۔ پیرس، لوزاں، وینس، ایتھنز۔ میں نے بھی تو یہی سفر کیا تھا۔ پیرس، لوزاں، وینس، ایتھنز۔

وہ سب جگہیں نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ میں بھول گیا کہ موٹر چلا رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی بیٹھا ہے اور ہم لندن جا رہے ہیں۔ وہ سارے نظارے ذہن میں اُبھرنے لگے۔

میں پھر رودبار انگلستان عبور کر رہا ہوں۔ سمندر خلافِ معمول پُرسکون ہے اور توقع کے خلاف دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ میں عرشے پر کھڑا نقشہ دیکھ رہا ہوں۔

پھر پیرس، لوزاں، وینس ہوتا ہوا تریست Trieste پہنچتا ہوں۔ اس کے شہر کی فضا ایسی ہے جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔ یہاں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو شک و شُبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جاسوسی قصّوں کے شائقین کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔

ابھی پہنچے دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پہلے

تو یونہی خیال سا تھا لیکن سمندر کے کنارے، پُرانے کھنڈرات میں، پہاڑیوں کی طرف۔ جہاں کہیں میں جاتا یہ شخص بھی پہنچ جاتا۔ میں نے اسے نظر انداز کیا۔ گھُورا۔ قریب جا کھڑا ہوا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دن بھر آنکھ مچولی ہوئی۔ آخر میں جھنجھلا اُٹھا۔ کباڑی بازار میں جب وہ سیڑھیاں اُتر رہا تھا میں نے اُسے گردن سے پکڑ لیا۔

"میرے پاس صرف دو دن تھے۔ ایک تو تم نے ضائع کر دیا اب اگر کل بھی تم نے میرا تعاقب کیا تو میں تمہارا بھُرکس نکال دوں گا۔"

اس کی گھِگھی بندھ گئی۔ "میں آپ کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ میں تو خود سیّاح ہوں۔ اور دن بھر ڈرتا رہا ہوں کہ آپ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس سے معافی مانگ کر تھوڑی دُور گیا ہوں گا کہ ایک عورت آگے آگے چلنے لگی۔ جس طرف میں مُڑتا وہ بھی پھرتی سے مڑ جاتی۔ یہ کیا تماشا ہے؟ شاید یہ سوچتی ہو گی کہ تعاقب کرانا تعاقب کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے رفتار تیز کر دی حتیٰ کہ اس کا سانس پھولنے لگا۔ یہ دوڑ جیت کر میں برابر سے نکل گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھاتے وقت دیکھتا ہوں کہ وہی عورت کونے میں بیٹھی ہے۔ مینیجر سے پوچھا معلوم ہوا کہ وہ بھی سیاحت کے سلسلے میں یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ لا

حول پڑھی اور سو گیا۔

اسٹیشن پر گیا۔ کسی نے بتایا کہ آج شام کو اورئینٹ ایکسپریس بلگراڈ جارہی ہے۔ مشہور نیلی ٹرین جو کبھی لندن سے وی آنا، بوڈاپسٹ، بخارسٹ، صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی تھی اور وہاں سے سیدھی بغداد۔ ریاست ہائے بلقان کے دنگے فساد تو ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ عجیب عجیب لوگ اس ٹرین سے سفر کیا کرتے۔ بادشاہ، جاسوس، سیاستدان، چور۔ جواہرات پر ڈاکہ، اغوا، قیمتی کاغذات کی چوری، دنیا بھر کے جرائم اس سے منسوب ہیں۔

اب یہ ان ملکوں سے نہیں گزرتی۔ بلگراڈ سے نش، وہاں سے ایک شاخ صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی ہے۔ دوسری سلونیکا ہو کر ایتھنز۔

شام کو میں اس ٹرین میں تھا۔ ڈبّے کے راستے میں کھڑا کھڑکی سے سبز پہاڑیاں دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اگا تھا کرسٹی کے ہیبت ناک قصّوں سے متاثر ہو کر خاص طور پر اس ٹرین سے سفر کر رہی تھی۔

"میں لندن سے آرہی ہوں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ ابھی میں نے اس ٹرین کے متعلق ایک ناول ختم کیا تھا۔ لیکن یہ ایکسپریس کہاں ہے، اتنی آہستہ چل رہی ہے۔ پھر وہ ماحول ہی ندارد ہے۔ سب لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ اب تک

کچھ بھی نہیں ہوا۔"

رات کے دس بجے نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ اُسے کھڑکی میں کسی کا سر نظر آیا تھا۔ دراصل کھڑکی کے شیشے میں اُس نے خود اپنے سر کا عکس دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر چیخ سنائی دی۔ اس مرتبہ اسے کھڑکی میں تلوار نظر آئی جو درحقیقت شیشہ اوپر نیچے کرنے کا ہینڈل تھا۔

رات بھر اس نے تنگ کیا۔ اسے بندوق، پستول، خنجر، چھُریاں، چاقو سب باری باری دکھائی دیئے۔ سوائے توپ کے جو بہت بڑی ہوتی ہے۔

ناشتے پر وہ غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ علی الصبح کسی اسٹیشن پر اُتر گئی۔ ایک انگریز انجنیئر کچھ مشینوں کی مرمت کرنے بلگراڈ جا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ ڈرا سا ہوا تھا۔ پوچھا کہ دن میں کیوں ڈرتے ہو؟ کہنے لگا "مشرق سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ یہ لوگ بے حد جوشیلے ہوتے ہیں جو جی میں آجائے کر گزرتے ہیں۔"

بلگراڈ پہنچ کر دیکھا تو واقعی مشرق شروع ہو چکا تھا۔ جھونپڑیاں اور فلک بوس عمارتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ بڑی بڑی کاروں کے ساتھ بیل گاڑیاں چل رہی تھیں۔ تیز ہوا چلتی تو گرد اُڑتی۔ مکھّیاں تھیں۔ بے شمار کتّے تھے۔ میں نے ایک پاؤنڈ کے دینار (مقامی کرنسی) لیے اور فوراً حلوہ خریدا جو گڑ کی طرح تھا۔

یوگوسلاویہ کے لوگ غریب ہیں۔ لیو بیرک ملاجو زاغرب سے مجھے ملنے آیا تھا۔ میں اس کے دوست سے لندن میں مل چکا تھا۔ لیو کو لندن میں تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا بلکہ جنون تھا۔ اس کے دوست کو برٹش کونسل والے وظیفہ دے کر ساتھ لے گئے اور یہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ دن بھر وہ لندن کی باتیں پوچھتا رہا۔

"لندن کی ایک اعزازی ڈگری تو تم آج ہی اپنے نام کے ساتھ لگا سکتے ہو۔"

"سچ مُچ؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں نے ایک اعلیٰ ڈاکٹر کا قصّہ سُنایا جو اپنا نام یوں لکھا کرتا۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔اے۔جے۔کے (لندن)

ایک دن بھید کھُل گیا۔ عدالت میں باز پُرس ہوئی تو اس نے جواب دیا کہ ڈاکٹر تو مجھے گھر والے پیار سے کہا کرتے تھے۔ اس لیے بچپن سے یہ لفظ نام کے ساتھ شامل ہے۔

"اور یہ A.J.K London کیا ہے؟"

"آرزو جانے کی لندن۔" اس نے جواب دیا۔

لیو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور لندن کے گُن گاتا رہا۔ چلتے وقت اس نے مجھے اپنے عزیزوں کا پتہ دیا جو مقدونیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

بلگراڈ سے روانہ ہوا تو دلچسپ ہم سفر ملا۔ حسام الدّین۔ وہ شام کا رہنے والا تھا۔ سُرخ و سفید رنگ، بحث و مباحثے کا شوقین۔ فرانس سے واپس دمشق جا رہا تھا۔ عرب ممالک کا ذکر چھڑتے ہی اس نے بکریوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ”بکری ایک ایسی لعنت ہے جو ہم سب کو لے کر بیٹھ گئی۔ رومن شمالی افریقہ میں زیتون اور نارنگیاں اُگاتے تھے۔ بحیرہ روم کا ساحل ہرا بھرا تھا۔ جہاں عرب گئے بکری ساتھ گئی۔ بھیڑ صرف کونپلیں کھاتی ہے۔ لیکن بکری جڑوں تک کو نہیں چھوڑتی۔ جب پودے اور درخت ختم ہوئے تو یہ علاقے اُجاڑ ہو کر صحرا بن گئے۔ بکری کے دُودھ سے لمبا بخار بھی چڑھتا ہے۔ پھر ہم میں یہ عیب ہے کہ ہم فالتو بحث بہت کرتے ہیں۔ جب ہلاکو خان بغداد کو تباہ کرنے آ رہا تھا تو باقاعدہ خبریں پہنچ رہی تھیں لیکن بغداد کے علما ایک اہم مباحثے میں مشغول تھے۔ بحث کا موضوع تھا کہ اُلّو حلال ہے کہ حرام۔“

”زوال کی اور بھی تو کئی وجوہات ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مغرب ہمارے زوال کی وجہ ہمارا مذہب اور سُست کر دینے والی آب و ہوا بتاتا

ہے۔ لیکن جب ہم نے ملک پر ملک فتح کئے تب بھی یہی مذہب تھا اور یہی آب و ہوا۔ دراصل مغرب نے ہمیں صلیبی جنگیں جیتنے پر اب تک معاف نہیں کیا لیکن لُطف تو یہ ہے کہ ہم سے لڑنے وہ لوگ آئے جن کا مذہب سکھاتا ہے کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو۔ جب رچرڈ لڑنے آیا تو آتے ہی فرمائشوں کی بارش کر دی ذرا انگور تو بھجوایئے۔ گرمی ہے کچھ برف اور شربت ارسال فرمایئے۔ طبیعت ناساز ہے کسی حکیم سے کہیئے کہ دیکھ جائے۔ آج طبیعت اچھی ہے مُرغ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کی موسیقی کی تعریف سُنی تھی کبھی سنوایئے۔ صلاح الدّین نے سب فرمائشیں پوری کیں۔ ایک مرتبہ بھی نہ کہا کہ میاں لڑنے آئے ہو یا ناز برداریاں کرانے۔ ہم نے یورپ کو شولری سکھائی، عورتوں کی عزّت، معاہدوں کا احترام۔"

"مگر صلاح الدّین تو مغرب کے ہیرو ہیں۔"

"ہم کہاں کہاں پہنچ چکے تھے۔ پیرس سے تین منزل ادھر ہم نے جنگ لڑی۔ وی آنا کا بار بار محاصرہ کیا۔ یونان اور بلقان کی ریاستوں پر چار سو سال حکومت کی۔ ہسپانیہ میں سات سو برس رہے۔ ہم نے اٹلی پر چھاپے مارے۔ روم کی دیواریں گرائیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ہماری نشانیاں اب تک موجود ہیں۔ لیکن اب

ہم سے سب کچھ چِھن چُکا ہے۔ شام اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ہمارے شہروں کے کھنڈر ہڈیوں کی طرح چمکتے ہیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ دنیا کی تقریباً ہر قوم کو یہی شکایت ہے کہ وہ تنزّل پر ہے۔ سب اپنی پرانی تاریخ کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے۔

ہم مقدونیہ میں داخل ہوئے۔ سکندرِ اعظم کا وطن۔ سرسبز پہاڑیاں چشمے اور خودرَو پھول۔ جب میں لیو کے کُنبے سے ملنے چھوٹے سے اسٹیشن پر اُترا تو وہاں اذان ہو رہی تھی۔

یہ بے حد پُر خلوص اور سیدھے سادے لوگ تھے۔ انہوں نے بڑی خاطر کی۔ مجھے اُن کی زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ پھر بھی ہم دوست بن گئے۔ دن بھر میں نے ان کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا۔ چھوٹے سے باغ میں پودوں کو تراشنے میں مدد دی۔ شام کو تاروں بھرے آسمان تلے ان کی موسیقی سُنی۔

خلوص کی کوئی خاص زبان نہیں ہوتی۔ یہ دل میں محسوس ہوتا ہے اور آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ مقدونیہ کا ایک منظر ہمیشہ میری آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں اُداس تھا اور اس یاد نے مجھے مسرور کر دیا۔ کئی مرتبہ یوں

محسوس ہوا جیسے یہ نظارہ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نرا واہمہ ہے۔

صبح صبح سورج کی شعاعیں پہاڑیوں سے پھوٹ رہی ہیں۔ آسمان کے مشرقی حصّے میں چند بدلیاں ہیں جو بالکل سُرخ ہیں اور تاحدِّ نگاہ لالہ کِھلا ہوا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے سُرخ پھول جھوم رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں پھول۔ اتنے پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا ابھی تخلیق ہوئی ہے اور ہر جگہ پھول ہی پھول ہیں۔ دنیا میں ہر طرف سچائی ہے مسرّت ہے شادمانی ہے۔

یونان کی سرحد عبور کی اور سلونیکا ٹھہرا۔ لیکن مجھے ماؤنٹ اولمپس دیکھنے کی جلدی تھی۔

جب پہاڑ نظر آیا تو دیر تک دیوتاؤں کے اس مسکن کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا لیکن پہاڑ کی چوٹیاں بادل اور دُھند سے چھُپی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں پر یا دُھند رہتی ہے یا بادل۔ ممکن ہے کہ یہاں اب بھی دیوتا رہتے ہوں۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں ضیافتیں ہوتی ہوں۔

ایتھنز جاتے وقت جو علاقہ آتا ہے وہ بالکل جہلم اور راولپنڈی کے علاقے جیسا

ہے۔ شاید اسی لیے یونانی ٹیکسلا میں آباد ہو گئے تھے۔ یونان سے ہندوستان تک جانی پہچانی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ وہ خوش رہے مگر جب آگے میدان دیکھے تو گھر یاد آیا اور واپس لوٹ گئے۔

ایتھنز پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی دوڑ کر ایکروپلس دیکھ لوں۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی بھاگا۔ شہر کے پرانے حصّے سے گزرتا ہوا اس پہاڑی کے پیچھے پہنچا جہاں پر ایکروپلس ڈھائی ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک آئی۔ پھر چڑھائی، پھر چاندنی میں چمکتی ہوئی وہ عمارت جسے دیکھ کر سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ بیتی ہوئی صدیاں، وقت کے تباہ کن حملے، حیات و ممات کا لامتناہی سلسلہ، کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس اداس دنیا میں ایسی شگفت چیزیں بھی موجود ہیں جن پر خزاں نہیں آئی۔ جو غیر فانی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابھی سب کچھ تباہ نہیں ہوا۔ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ یہ منروا کا مندر ہے۔ یہ ہرکولیز کا معبد ہے۔ یہ قدیم دنیا کا عجوبہ پارتھینون جسے فنکار فڈیاس نے تعمیر کیا۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب ایتھنز ساری مہذب دنیا کا قلب تھا۔ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا میں اس صنم کدے میں داخل ہوا جہاں کبھی نہایت عظیم انسانوں کی

آوازیں گونجی ہوں گی۔ افلاطون، سقراط، اقلیدس، ڈیموستھینز، فیثا غورث، ہیروڈوٹس، پیری کلیز۔

علی الصبح میں نے ایکروپلس سے طلوعِ آفتاب دیکھا۔ نیچے اولمپیا کے دیوتا زیوس کا مندر ہے۔ سامنے پہاڑی پر قید خانے کی کوٹھڑیاں ہیں جہاں سقراط کو زہر دیا گیا۔ ایک طرف ڈیونس کا تھیٹر جہاں سکائلس، یوری پڑیز اور سفوکلیز کے ڈرامے کھیلے گئے۔ اس کے ساتھ موسیقی کا مندر اوڈین اور دور نیلا سمندر۔

نیلا آسمان، نیلا سمندر، رنگین پھُول۔ حسین ستون، متناسب، نفیس نستعلیق جیسے کسی دلکش نظم کے اشعار۔

بتائے ہوئے پتے پر فون کیا۔ مانوس ہارالامبیز ملنے آیا۔ اکٹھے کھانا کھایا۔ پلاؤ، دہی، کباب، کوفتے اور حلوہ۔ ریڈیو پر ریکارڈ بج رہے تھے۔ غالباً فوجی بھائیوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔ دُھنیں مشرقی تھیں۔ اس نے بتایا کہ حکیم فیثا غورث کو موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس سلسلے میں وہ ہندوستان گیا تو یونانی موسیقی کو بیس نئے ٹھاٹھ ملے جو صدیوں تک رائج رہے۔

بل ادا کر کے میں نے بیرے کو دو سو درہم کا نوٹ دیا۔ وہ اس قدر خفا ہوا کہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ صرف دو سو درہم دے کر نہ

صرف میں نے اُس کی توہین کی تھی بلکہ اس کا کیرئر تباہ کر دیا تھا۔

یونان میں کرنسی کی قیمت ابھی ابھی گری تھی۔ پہلے پاؤنڈ کے عوض بیالیس ہزار درہم ملتے تھے، اب چوراسی ہزار درہم ہو گئے۔ جیسے پنسلین کے معمولی سے ٹیکے میں کئی لاکھ یونٹ ہوتے ہیں۔ دس پاؤنڈ کا سفری چیک دیا تو آٹھ لاکھ چالیس ہزار درہم ملے جنہیں اُٹھانا مشکل ہو گیا۔ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ لکھ پتی بننے کا موقع نصیب ہوا۔

یونان میں موسمِ بہار تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بے شمار خودرَو پھول کھلے ہوئے تھے۔ سمندر، آسمان اور جزیرے۔ ان سب میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ یہ رنگ آپس میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سنگِ مرمر کے حسین ستون، رنگین پھُول، نیلے سمندر میں خوشنما جزیرے۔ یہ سب یونانی ہی میں یکجا ملتے ہیں۔

”موسم بہار میں یونانی تنہا نکلنا گناہ سمجھتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”بھئی تمہارا نام بہت لمبا ہے۔ یاد نہیں رہتا۔“

”مجھے ٹونی کہا کرو۔“

رات کو ہمارے ساتھ ٹونی کی منگیتر تھی اور اس کی دو سہیلیاں۔ ایک تو بالکل سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسے ایک ایک عضو پر خالق نے وقت صرف کیا ہو۔ آنکھوں کی ساخت ہونٹوں کی بناوٹ، پیشانی، گردن ہر چیز تراشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ مجسمہ کسی بُت تراش کا خواب تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیفنی"

"نہیں۔ یہ دیوی ایتھنا ہے۔"

"تم لندن وندن چھوڑو اور آج ہی سے بُت تراشی شروع کر دو۔ یونان کا موسم بہار بڑا تیز ہوتا ہے۔"

"تمہارے ہاں ہر چیز میں حُسن ہے۔ پانی، مٹی، پھر انسان سب حسین ہیں۔ تبھی یونانیوں نے شعر کہے، نغمے گائے اور بُت تراشے۔"

"وہ قدیم یونانی تھے۔ اب ہم نکمّے ہیں، قلاش ہیں۔"

"لیکن تم بہت سے ملکوں سے اچھے ہو جو مفلس بھی ہیں اور حسن سے بھی محروم ہیں۔"

ڈیفنی ہماری طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔

"تم اسے گھر چھوڑ آنا۔"

"میں راستہ بھول جاؤں گا۔"

"یہ بتادے گی۔ یہ انگریزی جانتی ہے اور اس نے ہماری باتیں سمجھ لی ہیں۔۔"

محفل ختم ہوئی۔ ٹونی کار چھوڑ گیا۔ ڈیفنی کو میں ایکروپلس لے گیا۔ ستونوں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ حسین کھنڈر ایک شکستہ رباب معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے اسے اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں کبھی ایتھینا کا سونے اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا مجسمہ تھا

"مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"فڈیاس نے اپنی ساری صنّاعی صرف کر کے ایتھینا کا بُت بنایا۔ صدیاں گزریں۔ یہ مجسّمہ کھو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد آج ملا ہے۔ میں ایتھنز والوں کو بتانے جا رہا ہوں کہ تمہاری دیوی واپس لوٹ آئی ہے۔"

وہ مُسکرانے لگی۔ "تمہیں ہمارے ملک کے ماضی کی ساری باتیں معلوم ہیں۔"

"لیکن ایتھنا! یونان ہمارا ہی نہیں میرا بھی ہے۔ مجھے بھی حسین چیزوں سے اُلفت ہے۔"

اگلا دن ہم دونوں نے کورنتھ میں گزارا۔ سمندر میں نہا رہے تھے۔ بہت سی نگاہیں ہم پر تھیں۔

"یہ سب تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"نہیں۔ یونانیوں کو وہ نظارہ یاد آرہا ہے جب سمندر کی لہروں سے ایک بہت بڑی سپی کھُلی اور اس میں سے دیوی وینس شرماتی لجاتی باہر نکل آئی۔"

"میں پہلے ہی بہت مغرور ہوں تم مجھے اور بگاڑ دو گے۔"

"زیوس کے بیٹے اپالو اور ڈیلفی کی کہانی مجھے یاد ہے۔ دیویاں تو ہمیشہ مغرور ہوا کرتی ہیں۔"

"مگر میں تو آرٹ کی ایک معمولی سی طالب علم ہوں۔"

"آرٹ کے مجسّموں کو آرٹ پڑھنا نہیں پڑھانا چاہیے۔"

لیکن اگلے دن میں ٹونی سے کہہ رہا تھا "دوست میرے پاس صرف چار دن اور ہیں اور ابھی سارا یونان دیکھنا ہے۔"

"ڈیفینی سارا یونان ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں۔ میں کچھ دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ میں سیّاح ہوں۔"

ہم مراتھون گئے۔ وہ میدان دیکھا جہاں ایک زبردست جنگ ہوئی تھی۔ مشرق اور مغرب کا پہلا مقابلہ۔ اس شکست کے بعد مشرق ہمیشہ دبا دبا سا رہا۔ یونانیوں نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ خوشخبری لے کر ایک سپاہی پورے بائیس میل بھاگا آیا۔ اہلِ ایتھنز کو یہ خبر سُناتے ہی مر گیا۔ اس کی یادگار میں مراتھون دوڑ ہوتی ہے۔

ٹونی کہنے لگا۔ "پتہ نہیں چار میل کا اضافہ کس سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اب لوگ چھتیس میل دوڑتے ہیں۔ کوئی خوشخبری نہیں لاتے اور زندہ رہتے ہیں۔"

ٹونی یا تو بے حد ذہین تھا یا بالکل نیم انٹلکچوئل۔ لیکن اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔

"سکندر تمہارے ملک میں گیا تھا۔ کچھ عرصہ یونانی بھی وہاں رہے ہیں۔" ٹونی بولا۔

"ہاں اب بھی ہمارے ہاں سکندر خان، سکندر علی اور سکندر بخت ہوتے ہیں۔

یونانی دواخانے اس ملک میں نہ ہوں، لیکن ہمارے ہر قصبے میں موجود ہیں۔ حکیم جالینوس کو ہم نہیں جانتے، لیکن نمک جالینوس اور جوارش جالینوس ہر روز کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ ہر شہر میں اوڈین نام کا سینما ہال ہوتا ہے جہاں ہونّق قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔"

ٹونی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

"لیکن سکندر ہمارا ہم وطن نہ تھا۔ وہ مقدونیہ کا باشندہ تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی قسم کا دیوتا ہے۔ مصری دیوتا بننے کے لیے اس نے مصر کا طویل سفر کیا۔ مصریوں نے ڈر کر فوراً اسے مان لیا۔ لوگ بڑے آدمیوں کی ہر بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ جنگ میں پہلی مرتبہ زخم لگا تو اسے تعجّب ہوا کہ معمولی آدمیوں کی طرح خون کیوں بہہ رہا ہے۔"

"مگر وہ جینیئس تھا۔" میں نے سکندرِ اعظم کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جینیئس بھی خوب ہوتے ہیں۔ ہمارے دیوجانس کلبی کو فطرت کے ہر نپے تُلے قانون سے نفرت تھی۔ اس نے بغاوت کی، یہ کیا ضروری ہے کہ زندہ رہنے کے لیے انسان سانس لے۔ اس نے سانس لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

دیوجانس اللہ کو پیارا ہوا۔ آخری دنوں میں دیوجانسن نے ٹب میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ جب سکندر اس سے مِلنے گیا تو پوچھا "میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" دیوجانسن نے جمائی لی اور کہا "ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے۔ ایک جینیئس کی بات دوسرا جینیئس ہی سمجھ سکتا ہے۔ سکندر اس جواب سے اس قدر خوش ہوا کہ بولا۔ اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس بننا پسند کرتا۔"

"غسل کرتے کرتے ارشمیدس کو ایک مسئلے کا حل سوجھ گیا۔ اسی حالت میں یوریکا یوریکا چِلّاتا باہر بازار میں نِکل گیا۔ بھلا آدمی کم از کم تولیہ ہی باندھ جاتا۔ پھر لائی کرگس کو سپارٹا والوں نے اصلاحات رائج کرنے کے لیے بُلایا تو اس نے آتے ہی یہ قانون نافذ کیا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں کھانا نہ کھائے۔ اس طرح فضول خرچی ہوتی ہے۔ چنانچہ سپارٹا بھر میں لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ کچھ دیر تو ایسا ہوا پھر سب ایک دوسرے کو بار بار دیکھ کر تنگ آنے لگے۔ فسادات شروع ہو گئے اور لائی کرگس کو بھاگنا پڑا۔ صرف پیری کلیز کے دنوں میں یونانی اپنے جینیئس حضرات سے کچھ عرصہ خوش رہے۔ اس کے مرتے ہی انہوں نے غریب انکساغوزا کو سمندر پار بھجوا دیا۔ فڈیاس کو قید کر کے ہلاک کر دیا۔ سقراط کو زہر دے دیا۔ افراتفری مچ گئی۔ کچھ اور لوگوں نے کچھ اور لوگوں کو مارا۔ چنانچہ یونانیوں نے دو تین مہینے کے اندر اندر اپنے سارے جینیئس

ٹھکانے لگا دیئے۔"

"مگر تمہارا عہد زرّیں خوب تھا۔ بقراط اب تک بابائے طب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی طبّی قسم اب بھی ڈاکٹر اُٹھاتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد افلاطون نے اُستاد کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی کم نہ تھا۔ ارسطو کا شاگرد سکندرِ اعظم۔"

"کیا تو وہ دن تھے کہ کسی اچھے اُستاد کے سامنے بیٹھ کر سبق یاد کر لیا اور بیڑا پار ہے۔ اب بیچارے اُستاد ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں لیکن طالب علم کورے کے کورے رہتے ہیں۔"

"ہر جگہ یہی شکایت ہے۔"

اولمپیا گئے۔ پرانا سٹیڈیم دیکھا جہاں سب سے پہلے اولمپک کھیل ہوئے تھے۔ پھر مائیسینیا، سپارٹا، طرس۔ وہی نیلے جزیرے، خود روپھُول، متناسب ستون اور حسین مجسمے۔

"نصف سے زیادہ یونان تو برٹش میوزیم میں بند ہے۔ لارڈ املگین بہت کچھ لے گئے تھے۔ اب تو جگہ جگہ یہ لکھا ہے۔ یہاں فلاں بُت نصب تھا۔ یہاں فلاں چیز ہوا کرتی تھی۔ اس جگہ دیوی ہائیجیا کا بُت تھا جس کے نام پر ہائیجین ہے۔ بقیہ

یونان تم لندن پہنچ کر دیکھنا۔"

رات کو رقص پر ٹونی کی منگیتر اور ڈیفنی سے ملاقات ہوئی۔ مجھے کچھ سوچتا دیکھ کر ٹونی نے قہقہہ لگایا۔

"تم پر سفوکلیز کا اثر ہو گیا ہے۔ اس نے ہمیشہ دنیا کو تج دینے اور بھج نام ہری کارے گانے کی تلقین کی۔"

قیام ختم ہوا۔ میں سمندری راستے سے استنبول جا رہا تھا۔ ٹونی بندرگاہ پر چھوڑنے آیا۔

"تم کچھ ڈھونڈ رہے ہو۔ اگر برساتی کی تلاش ہے تو وہ تمہارے کیبن میں رکھی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں ہر روز دھوپ نکلی تھی لیکن برساتی ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی تھی۔"

"اس سے کچھ دوستی سی ہو گئی ہے۔"

"جب برساتیاں رفیق بننے لگیں تو ایک خطرناک ذہنی دور شروع ہوتا ہے۔ اچھا اب اگلی مرتبہ آؤ تو ارستوفینز کی طربیہ تحریریں پڑھ کر آنا۔"

آئیونین سمندر میں جزیرے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ یونانی

مندروں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ یہیں کہیں حضرات ہیلن کو لے اُڑے تھے۔

سمندر کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ سیاہی مائل ہو گیا ہے۔ جہاز اطالوی کمپنی کا ہے۔ اس لیے لذیذ غذا ملتی ہے۔ دن بھر موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے اور رات کو محفلِ رقص و سرود گرم ہوتی ہے جس میں جرمن حصّہ نہیں لیتے۔ جرمن ہمیشہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ نطشے کا فوق الانسان انہیں اب تک نہیں بھولا۔

کچھ امریکن لڑکیاں بھی ہیں جو زینتِ محفل بنتی ہیں۔ ایک سنہرے بالوں، چنچل آنکھوں والی لمبی لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اس کا نام مارگریٹ ہے۔ لیکن اس کی سہیلیاں اسے سینڈی Sandy کہتی ہیں۔ جہاز کا کپتان Capitano پچاس برس سے زیادہ کا ہے۔ پستہ قد ہے، گنجا ہے، لیکن صبح سے سینڈی کے گرد طواف کر رہا ہے۔ جہاز کوئی اور صاحب چلا رہے ہیں۔

ڈیک ٹینس میں کیپی تانو اور ایک لڑکی کو میں اور سینڈی بڑی آسانی سے ہرا دیتے ہیں کیونکہ وہ ٹکٹکی باندھے اس شوخ و شنگ حسینہ کو دیکھ رہا ہے۔

شام کو وہ کہتی ہے "کیپی تانو ہم سے جہاز چلوائے گا۔ آج رات ہم چار لڑکیوں کو اوپر بُلایا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"مگر یہ آدمی مشتبہ سا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔"

"اور بے چارہ کیپی تانو؟"

"نہیں! تم ہمارے ساتھ ضرور چلو گے۔"

رات کے دس بجے چار لڑکیاں اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ کیپی تانو کا چہرہ دمک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اوس سی پڑ گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے ملازم کو بتایا "شراب کی بوتلیں اُٹھالاؤ اور چاء لاؤ۔" دو لڑکیوں کو نقشے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ تیسری کو ان کی مدد کرنے کے لیے۔ مجھے وہ مشین دی گئی جس سے جہاز کا رُخ بدلتے ہیں۔ "اوپر چلو دوربین سے ستارے دیکھیں گے۔" اس نے سینڈی سے کہا۔ چلتے ہوئے وہ ایک لڑکی کو ساتھ لے گئی۔ چنانچہ فوراً یہ تینوں واپس آ گئے۔

لڑکیوں کی ڈیوٹی بدلی گئی اور مختلف جگہوں پر اُنہیں بٹھایا گیا۔

"چلو لہریں دیکھتے ہیں۔"

سینڈی پھر ایک لڑکی کو ہمراہ لے گئی۔

آخر تینوں لڑکیوں کو اوپر بھیج دیا گیا۔ سینڈی اور وہ کیبن میں تھے۔ میں جہاز کا

رُخ دیکھ رہا تھا۔ یکایک سینڈی نے مجھے آواز دی اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر چلا گیا۔ کیپی تانو ہڑبڑا کر باہر نکلا اور وہ مشین تھام لی۔ آدھ گھنٹے تک یہ آنکھ مچولی ہوئی۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

کیپی تانو لگاتار مجھے گھورتا رہا۔ وہ بے حد خفا تھا۔

نیچے آئے تو تینوں لڑکیاں شب بخیر کہہ کر سونے چلی گئیں۔ سینڈی اور میں اکیلے رہ گئے۔

اس نے بتایا کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ یورپ کی سیر کو آئی ہے۔ اس کے والد کروڑپتی ہیں۔ ان کے ہاں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

"لیکن میں بے حد اداس ہوں۔ اپنی روح کی تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"ہم سب اداس ہیں اور تنہا ہیں۔"

"مگر کیوں۔"

"اس کا جواب تو بڑے بڑے مفکّر نہ دے سکے۔"

"لیکن تم تو خوش رہتے ہو۔"

"میں خوش ہوں اس لیے کہ میں غمگین ہوں۔"

"یہ کیسے۔"

"میں مفکّر ہوتا تو شاید بتا سکتا۔"

"ہائے کتنی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"ہائے یہ لہریں کتنی پیاری ہیں۔ آؤ انہیں گنیں۔۔۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔"

صبح کیپی تانو نہایت بے چین تھا جیسے تپتی ہوئی اینٹوں پر بلّی۔ ملازمین کو بُرا بھلا کہتا۔ سر پر جو آٹھ دس بال تھے وہ بھی پریشان تھے۔ انہیں وہ بار بار نوچنے کی کوشش کرتا۔ اس نے مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

جہاز پر اطالوی جھنڈے کے ساتھ ترکی کا سُرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہلال اور تارہ۔ میں سینڈی کو بتا رہا تھا کہ "چاند تارے کا نشان پہلے باز نطینیوں کا تھا۔ ایک جنگ جیت کر عربوں نے ہتھیا لیا۔ اب یہ ہمارا ہے۔"

"سب کچھ جیت کر لینا چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم درۂ دانیال سے گزر رہے تھے۔ سمندر یہاں چھوٹا سا دریا معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف یورپ ہے۔ دوسری طرف ایشیا۔ یہ پرانا ہیلنز پونٹ ہے۔ یہاں قدیم ٹرائے آباد تھا۔ سکندر اسے عبور کر کے ایشیا گیا۔ ایرانی بادشاہ زرکیز نے

یورپ پر حملہ کرتے وقت یہاں کشتیوں کا پُل بنوایا۔ یہ پُل جسے ٹھیکیداروں نے بنایا تھا، تیز ہُوا سے تباہ ہو گیا۔ بادشاہ نے فوج کے سامنے ان ٹھیکیدار حضرات کا انتقال کروایا اور والنٹئیر مانگے۔ اس مرتبہ ایسا مضبوط پُل بنا جسے غالباً بادشاہ نے یورپ سے بھاگتے وقت بھی استعمال کیا۔

یہاں سمندر کو بائرن نے بھی تیر کر عبور کیا تھا۔ لیکن محض تفریحاً۔ بائرن ایسی حرکتیں اکثر کیا کرتا تھا۔ آخر دور مسجدوں کے گنبد اور مینار دکھائی دیئے۔ یہ استنبول تھا۔

سینٹ صوفیہ، سینٹ صوفیہ۔

سب دوربینوں سے ڈیڑھ ہزار سال پرانے گرجے کو دیکھ رہے تھے جو اب مسجد اور میوزیم ہے۔

جہاز آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یکایک ساتھ کھڑی ہوئی دو لڑکیوں نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ سامنے ساحل پر کچھ خواتین بھی اسی سٹائل میں رُو رہی تھیں۔ مجھے شُبہ ہوا کہ شاید ان کی غیر حاضری میں کوئی عزیز چل بسا ہو گا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کیا عمر تھی مرحوم کی؟"

انہوں نے بتایا کہ وہ فرطِ انبساط سے رو رہی ہیں۔ ان کے ہاں یہ رواج ہے۔ اگر فرائڈ آج زندہ ہوتا تو اس کی وجہ بتاتا۔ یہ سب شاید اس لیے رو رہی ہیں کہ اب پھر اکٹھے رہنا پڑے گا۔ غالباً جُدا ہوتے وقت یہ ہنستے ہوں گے۔ یہ لڑکیاں ہنگری کی تھیں۔ اچھّا ہوا میں ہنگری نہیں گیا۔

"اگر یہاں ملاقات نہ ہو سکی تو پھر میں لندن میں ملوں گی۔" سینڈی نے چلتے وقت کہا۔

ترک خوبصورت ہیں۔ تندرست و توانا۔ ہنس مکھ۔ گورے چٹّے۔ مغربی لباس۔ السّلام و علیکم کی جگہ مرحبا کہتے ہیں اور وعلیکم السّلام کی جگہ بھی مرحبا۔ کرنسی دیکھ کر گھر یاد آ گیا۔ روپے پر چاند تارا بنا ہوا ہے اور پیسوں میں سُوراخ ہے۔ مگر ماشاء اللہ، سبحان اللہ، زراعت، تجارت، تقسیم، مرکز، جمہوریت کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

خطوط پر ٹکٹ لگانے ڈاکخانے گیا۔ کلرک نے ملک کا نام پڑھ کر وہیں سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور مجھے پوسٹ ماسٹر کے کمرے میں لے گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ انگریزی میں باتیں ہونے لگیں۔ "آپ کے ملک سے ہمیں بے حد دلچسپی ہے۔ مگر وہاں سے بہت کم لوگ یہاں آتے ہیں۔"

"آپ بھی تو ہماری طرف نہیں آتے۔" میں نے شکایت کی۔

ان کے گھر شام کو چاء پر ایک نہایت نفیس بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ قاسم بے۔ طویل قامت، پانچ زبانوں کا ماہر جنگِ آزادی میں کمال اتاتُرک کے دوش بدوش لڑ چکا تھا۔

"برخوردار میں تمہیں استنبول دکھاؤں گا۔"

ہم دونوں غلاتا پُل پر کھڑے تھے۔ گولڈن ہارن کا دلکش نظارہ۔۔ دُور تک پانی میں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ جیسے لاتعداد جگنو چمک رہے ہوں۔ مسجدوں کے گنبد اور مینار تیز روشنی سے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ اسے دنیا کے بہترین نظاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ بازنطینیوں کا قسطنطنیہ ہے جسے روم کی طرح سات پہاڑیوں پر بسایا گیا۔ عثمانیوں کا استنبول۔ آج سے پورے پانچ سو سال پہلے سلطان محمد فاتح نے اس پر حملہ کیا۔ بازنطینیوں نے سمندر میں لوہے کی زنجیریں ڈال دیں۔ سلطان نے پہاڑی کے ایک حصّے کو ہموار کرایا تختے بچھوائے، اُنہیں چکنا کیا اور راتوں رات اپنے بہتّر جہاز خشکی کے تختوں کے اوپر سے کھینچ کر دوسری طرف پانی میں اتار دیئے۔ تب سے اب تک یہ شہر ترکوں کے قبضے میں ہے۔ سلطان کا یہ کارنامہ دنیا

کی عسکری تاریخ میں لکھا جاتا ہے۔

صبح صبح قاسم بے مجھے ساتھ لے گیا۔

یہ سراغلیو کے قدیم محلّات ہیں۔ یہ مقام اس وسیع سلطنت کا مرکز تھا جو سلیمان کے زمانے میں وی آنا تک پہنچ چکی تھی۔ بحیرہ روم کے تقریباً سب ملک ترکوں کے قبضے میں تھے اور یہ وسیع سمندر ترکوں کی جھیل بنا ہُوا تھا۔ یہ حرم ہے، جس میں جگہ جگہ ویٹنگ روم بنے ہوئے ہیں۔ یہ میوزیم کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ سکندر کا تابوت جس میں سکندر نہیں ہے۔ سنگِ مرمر کا بنا ہوا آرٹ کا نادر نمونہ جسے برٹش میوزیم والے بہت بڑی قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں رواج تھا کہ فن کار مشہور ہستیوں کے تابوت ان کی زندگی میں بنادیتے تھے تاکہ بعد میں دقّت نہ ہو۔ بڑے آدمی خوش ہو کر سند دیا کرتے ہوں گے کہ ”میں اس عزّت افزائی کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ اس تابوت کی ساخت، کوالٹی اور سائز سے میں مطمئن ہوں۔ امید ہے کہ اس کے استعمال کا موقع مجھے عنقریب ملے گا۔“ یہ وہ منبر ہے جس سے حضرت صالح وعظ کیا کرتے تھے۔ یہ اپالو اور زیوس کے بُت ہیں۔ یہ کسی ممّی کا صندوق ہے۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت کا مطلب یہ ہے ”بھائیو! میرے پاس کچھ نہیں ہے مجھے تنگ مت کرو۔“ مصر میں ممی کے

ساتھ زادِ راہ کے طور پر دولت بھی دفن کی جاتی تھی جسے لوٹنے کے لیے چور بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ اس شخص کو بھی یہی ڈر ہو گا۔ چنانچہ اس نے اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا۔ لیکن چور غالباً ان پڑھ تھے۔ صرف خالی صندوق مِل سکا۔ ممی نہیں ملی۔ نہ جانے کیوں مصری قبر کے اوپر اتنے بڑے بڑے اہرام کھڑے کر دیتے تھے کہ جنہیں بیس بائیس میل سے بھی دیکھ کر کسی ریٹائرڈ چور کا جی للچا اُٹھے۔

یہ اُس رحمدل اور خُدا ترس خاتون فلارنس نائیٹنگیل کا ہسپتال ہے۔ یہ ہپوڈروم کا چوک ہے جہاں سے بازنطینی شہنشاہ کھیل کود ملاحظہ کیا کرتا۔ سمندر کا یہ حصّہ باسفورس کہلاتا ہے۔ ہم یورپ میں کھڑے ہیں اور ایشیا دوسرے کنارے پر ہے۔ ایشیا اور یورپ میں صرف چند سو گز کا فاصلہ ہے لیکن مشرق اور مغرب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔

ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ دہی کی لسّی مفت ملتی ہے۔ کھانے میں کئی قسم کے کباب ہیں۔ کوفتے، نان، دہی اور سویّاں۔

اتنے دنوں کے بعد سویّاں چکھ کر میں بہت خوش ہوتا ہوں اور قاسم بے کو بتاتا ہوں کہ سویّاں ہمارے ہاں بھی ہوتی ہیں۔

"لیکن ہمارے ہاں صرف خاص موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں جیسے اب رمضان کا مہینہ ہے" ہم نہایت خوشنما مسجدیں دیکھتے ہیں۔ سنگِ سُرخ، سنگ خارا، سنگ مرمر کی بنی ہوئی۔ باہر پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اندر بجلی کی روشنی ہے۔ بڑی رونق ہے۔ یہ مسجد سانس لیتی ہوئی لگتی ہیں۔ یہاں عبادت گاہیں زندہ ہیں۔"

"برخوردار ہمارے ملک میں سب سے اہم چیز کام ہے۔ ہمیں زیادہ فرصت نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم نماز بہت جلد پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو صرف عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جب تک باشندے ان فرائض سے کوتاہی نہیں کرتے جو ان پر ملک اور سوسائٹی نے عائد کیے ہیں وہ سب سماج کے مفید رکن ہیں اور ان کے مذہبی عقیدوں اور ذاتی زندگی کے متعلق کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ بیکار رہنے لگیں یا قانون کی خلاف ورزی کرنے لگیں تو خواہ دن رات عبادت کیا کریں، سوسائٹی انہیں معاف نہیں کرتی۔ ملک کے لیے ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں خُدا سے ڈرتا ہوں۔ کوئی قابلِ اعتراض حرکت نہیں کرتا۔ روزی کمانے کے لیے محنت کرتا ہوں۔ لیکن میرے حقوق بھی تو ہیں۔"

"ہم ٹرکش کافی پیتے ہیں۔ چھوٹی سی پیالی میں میٹھی اور گاڑھی چیز۔ دو گھونٹ پی

کر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔"

"یہاں ترکی ٹوپی نظر نہیں آتی۔"

"سکاٹ لینڈ میں سکاچ وہسکی کہاں ملتی ہے؟" قاسم بے پوچھا ہے۔

گرینڈ بازار بازنطینیوں نے زمین کے نیچے بنایا تھا۔ یہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔

جوہری کی دکان پر قاسم بے نے ہیٹ اُتار کر دو عورتوں کو سلام کیا۔ وہ مُسکرائیں۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ میرا تعارف ہوا۔

معمّر خاتون قاسم بے کے دوست کی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی لڑکی تھی۔ شکیلہ۔ جو سچ مچ شکیلہ تھی۔ مُسکراتی تو بالوں میں دو ننھے مُنّے گڑھے پڑ جاتے۔

سہ پہر تک ہم ساتھ رہے۔ قاسم بے کو دفتر پہنچنا تھا چنانچہ میں ان دونوں کو چھوڑنے گیا۔ انہوں نے مجھے رات کے کھانے کے لیے ٹھہرالیا۔

شکیلہ لگاتار سوال پوچھ رہی تھی۔ "تمہارے ہاں لڑکیوں کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ معاشی حالت کیسی ہے؟ کتنی لڑکیاں شادی کرتی ہیں اور کتنی ذرا ٹھہر کے شادی کرتی ہیں؟ شادی کس طرح ہوتی ہے؟"

"آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں گی؟"

میرا اندازہ صحیح نکلا۔

"میں اس سلسلے میں آپ کو زیادہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن محبّت، شادی اور بچّے۔۔ ان کی سماجی، معاشی، ذہنی اور سیاسی حالت وہی ہے جو صدیوں سے چلی آئی ہے۔ لڑکے لڑکیاں پہلے شادی کو بُرا بھلا کہتے ہیں پھر شادی کر لیتے ہیں اور اپنے بچّوں کو دنیا بھر کے بچّوں سے حسین، عقل مند اور انوکھا سمجھتے ہیں۔ یہ بچّے بڑے ہو کر والدین کو بے وقوف تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن شادی کر لیتے ہیں۔ ان کے بچّے بڑے ہو کر سب کو خبطی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

وہ ہنسی اور گالوں میں پھر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔

"ہاں ایک بات میں بھول گیا۔ جب لڑکے لڑکیوں کو آپس میں محبّت ہوتی ہے تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ایسی محبّت نہ کسی نے آج تک کی ہے نہ کوئی آئندہ کر سکتا ہے۔ یہ لیلےٰ مجنوں، رومیو جولیٹ، شیریں فرہاد محض اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ یہ دوہا پڑھنے لگتے ہیں۔

دِھیاں جنوائی لے گئے اور بہوواں لے گئے پوت

کہو منوہر جانگلی تم رہے اُوت کے اُوت"

(اس کا ترجمہ سلیس انگریزی میں کر کے سُنایا)

"آپ نے فلسفہ پڑھا ہو گا؟"

"نہیں۔ میں فلسفیوں کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔"

"میں خبر دار رہوں گی، میں نے فلسفہ لے رکھا ہے۔"

اگلے دن میں اور شکیلہ باسفورس عبور کر کے حیدر پاشا پہنچے۔ استنبول اور اس کے مضافات باغوں سے پٹے پڑے ہیں۔ سبزہ، سرو کے درخت، پھول اور نفیس و نازک مینار۔

ہم بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں کارڈوں پر دوستوں کے پتے لکھ رہا تھا۔

"تم نے ابھی آہ بھری تھی؟ خیریت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آہ نہ تھی۔ سانس لیا تھا۔ لمبے سانس لینا صحت کے لیے مفید ہے۔ ویسے آہ بھرے تقریباً آٹھ برس گزر چکے ہیں۔"

"تمھیں اپنے عزیز یاد آرہے ہوں گے۔"

"یہ میرا برِّاعظم ہے۔ صبح میں یورپ میں تھا۔ اب اپنے وطن ایشیا میں ہُوں۔"

اگن بوٹ کی سیٹی سن کر ہم دونوں بھاگے۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر مجھے اپنا ہیٹ یاد آیا جو حیدر پاشا میں رہ گیا تھا۔

"چلو ابھی جا کر لے آتے ہیں۔" وہ بولی۔

"برساتی کھوئی جاتی تو ضرور تلاش کرتے، لیکن ایک ہیٹ کے لیے یورپ سے ایشیا کا سفر کرنا زیادتی ہے۔ غالباً یہ ہیٹ میری برساتی کو پسند نہیں تھا۔ اس لیے خود تو چلی آئی، اسے وہیں چھوڑ آئی۔"

بوندا باندی ہونے لگی۔ میں نے اُسے برساتی اوڑھا دی۔ ہم ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔

"تھک گئی ہو گی۔ بنچ پر بیٹھ جاؤ۔"

"اس کا روغن گیلا ہے۔" وہ ایک دم اٹھی۔ برساتی پر رنگ کا نشان پڑ گیا۔ گھر جاتے وقت برساتی لوٹانا اُسے یاد نہ رہا۔

ہم نے مرمرہ کے جزیرے دیکھے۔ رومیلی حصار گئے۔ ایک جگہ چند لمحوں کے لیے سینڈی سے ملاقات ہوئی۔

"اس لڑکی کا اندازِ گفتگو مجھے پسند نہیں آیا۔ یہ تمہیں اس طرح کیوں دیکھ رہی تھی؟" شکیلہ کچھ خفا ہو گئی۔

"مغربی لڑکیاں اسی طرح دیکھا کرتی ہیں۔"

"بالکل نہیں، ہم لوگ تو۔"

"تم مشرقی ہو شکیلہ۔ مغربی آداب، لباس اور طرزِ معاشرت کے باوجود تمہاری ایک ایک بات مشرقی ہے۔ یہ بتاؤ تمہیں گھر کب پہنچنا ہے؟"

"مغرب سے پہلے۔"

جاتے وقت وہ پھر برساتی لے گئی۔

ہم کشتی میں بحیرۂ اسود کی طرف جا رہے تھے۔

"تم نے آندرے موروا کی وہ کہانی پڑھی ہے۔ برساتی؟"

"نہیں۔"

شکیلہ نے مجھے کتاب دی۔ "اس میں ہے لیکن جب میں گھر چلی جاؤں تب پڑھنا۔"

رات کو میں نے کہانی پڑھی۔ ایک آرٹسٹ اپنے دوست کو بتا رہا ہے کہ کس طرح ایک معمولی سی بھورے رنگ کی برساتی سے اس کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آ گئیں۔ مختلف موقعوں پر اس نے برساتی مختلف لوگوں کو دی لیکن ہر مرتبہ نتائج مختلف نکلے۔ ایک دوست خواہ مخواہ دشمن بن گیا۔ ایک روٹھے ہوئے سے صلح ہو گئی۔ ایک دو کو غلط فہمیاں ہو گئیں۔ اگرچہ ان واقعات سے برساتی کا براہ راست کوئی تعلّق نہ تھا۔ لیکن ایک پُراسرار وابستگی ضرور تھی۔ ایک شام کو اس کی محبوبہ ملنے آئی جو بڑی سنگدل اور مغرور تھی اور شاید خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ چلتے وقت بارش ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ اسے برساتی پہنا دے۔ ایسی حقیر چیز دیتے ہوئے آرٹسٹ کو جھجک محسوس ہوئی کیونکہ وہ غریب تھا۔ آخر اس نے برساتی پہنا دی۔

"پھر کیا ہوا؟" سُننے والا پوچھتا ہے۔ اتنے میں ایک خوبصورت عورت کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

"ان سے ملیے۔ یہ میری بیوی ہیں۔" آرٹسٹ کہتا ہے۔

سُننے والے نے دیکھا کہ عورت نے وہی بھورے رنگ کی برساتی پہن رکھی تھی۔
میں نے شکیلہ کو کتاب واپس دی تو وہ خاموش سی تھی۔ دن بھر اس نے بہت کم

باتیں کیں۔ اگلے روز مجھے ازمیر جانا تھا۔

"تم پھر آؤ گے؟"

"ہاں کسی دن ضرور آؤں گا۔ لیکن جب تم آؤ گے تو مدبّر اور سنجیدہ بن چکے ہو گئے۔ تب تم میں یہ بچپنا ہو گا نہ شوخی۔ میری شادی ہو چکی ہو گی۔ تب دھوپ میں تمازت ہو گی نہ چاندنی میں ملاحت۔ یہ آسمان اور سمندر بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔"

میں ازمیر دو دن رہا۔ اب واپسی تھی۔ جہاز کا کپتان مجھے بتا رہا تھا۔ یہ ہومر اور اپالو کا وطن ہے۔ ہرکولیز آس پاس ہی کہیں لڑا تھا۔ وہ جزیرہ دُور نہیں جہاں بقراط طب پڑھاتا تھا۔ یہاں ڈائینا کا مندر تھا۔ دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک۔ یہاں سکندر آیا۔ ہنی بال، بروٹس، انطونی۔ سب باری باری آئے۔ اسی جگہ کمال اتاترک نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیلا تھا۔ آئیونین سمندر، ایجیبین سمندر، ایڈریاٹک، اٹلی، فرانس، رودبارِ انگلستان، لیکچر، کتابیں اور امتحان۔

کار سے عجیب سی آواز آنے لگی۔ رفتار مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اور جیر اللہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور موٹر روک لی۔ باہر نکلے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔

"یہ برساتی اوڑھ لو۔" میں نے اسے کہا۔

"اور تم جو بھیگ رہے ہو۔"

"نہیں، میں اسے اوڑھنا نہیں چاہتا۔"

موٹر کو ایک درخت کے نیچے لے گئے۔ انجمن کھولا۔ پہیّے دیکھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ آخر کافی دیر کی جستجو کے بعد جیر الڈ نے موٹر کے نیچے سے ایک بڑی ساری ٹہنی کھینچی جو پھنسی ہوئی تھی۔ اب کار خوب تیز چل رہی تھی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اسے سیر وسیاحت کا خبط ہے۔

"اگر میں کینیڈا میں رہنے لگوں تو وہ چند کھیت گزارے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن میرے پاؤں میں چکر ہے۔ ایک دو سال ملازمت کرتا ہوں۔ پھر اپنا صندوق پکڑ کر نکل جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو بے حد معمولی کام کرنے پڑتے ہیں۔ پچھلے سال میں بیس بیس گھنٹے فائلوں پر مغزمارا کرتا تھا۔ اس سے پہلے ایک چھوٹی سی دکان میں خزانچی تھا۔ سیر سپاٹا میرے خون میں ہے۔ مجھے کوئی چار دیواری میں بند نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق تمہیں بھی ہے۔"

میں نے اسے اپنی سیروں کے قصے سُنائے۔ بچپن کی سیریں، لڑکپن کی سیاحتیں، جنگ کے دنوں کے سفر، ذرا سی دیر میں ہم دوست بن گئے۔

"جہاں بھی گیا، ہر جگہ مہربان اور پُر شفقت لوگ ملے۔ میں کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ لیکن دوسروں سے مجھے ہمیشہ ہمدردی ملی، خلوص ملا۔ ہر جگہ میں نے وہ عظیم انسانی برادری دیکھی جس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔"

میں اس کے صندوق کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہیں اپنی برساتی سے نفرت کیوں ہو گئی؟"

"پرسوں تک یہ اچھی بھلی تھی۔ پھر کسی نے بغیر پوچھے اسے دھلوا دیا۔ اب یہ بالکل نئی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میرے صندوق اکثر کھوئے جاتے ہیں۔ نیا خریدتے ہوئے مجھے بھی بڑا افسوس ہوتا ہے۔ لیکن صندوقوں اور برساتیوں سے سیاحت کا کیا تعلق؟ یہ جذبہ یہاں ہوتا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ دُھند چھا گئی۔ اندھیر ہو چلا تھا۔

ایک موڑ پر بادل چھٹ گئے ۔ سورج نکل آیا۔ تیز شعاعوں سے سب کچھ جگمگانے لگا۔ فضا نِتھری ہوئی تھی۔ ایسے خوشنما نظارے آئے کہ موٹر چلانا مشکل

ہو گیا۔

کچھ اور آگے جا کر دُھند سی چھانے لگی۔ بادل سمٹ آئے اور اندھیرا چھا گیا۔ اتنی تیزی سے بارش ہونے لگی کہ معلوم ہوتا تھا کہ لندن تک ہوتی رہے گی۔

جیرالڈ بولا "سیّاح اکثر تنہا رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ انہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن سیّاحوں کو ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں جو دوسروں کے ذہن تک میں نہیں آ سکتے۔ ایسے لمحے آتے ہیں جب یہ ساری دنیا ان کی ہوتی ہے۔ یہ پراسرار رنگین دنیا جو اپنی دلفریب ہے جو سدا جوان رہتی ہے۔ پھر سفر ختم ہو جاتا ہے اور ایسا وقفہ آتا ہے جس میں تاریکیاں عود کر آتی ہیں سب کچھ ساکن ہو جاتا ہے۔ ایک دِلدوز تنہائی روح میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدم بوجھل ہو چکے ہیں اور تمام راستے بند ہیں۔ لیکن ایک سہانی صبح کو کونپلیں پھوٹتی ہیں اور دل ایک جانی پہچانی مسرّت سے آشنا ہوتا ہے۔ ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے اور وہ جمود یاد تک نہیں رہتا۔ یہ جگمگاتی شعائیں اور یہ تاریک گھٹا جہاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں وہاں ایک دوسرے کو نمایاں بھی کر دیتی ہیں۔"

دفعتہً بادل چھٹ گئے۔ سورج نکلا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک یوں چمکنے لگی کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ آسمان پر ایک رنگین قوسِ قزح چھا گئی۔

وہ کہہ رہا تھا ”ہم جہاں گردوں کو کوئی چار دیواری میں بند نہیں کر سکتا۔ ناآشنا راہیں ہماری منتظر ہیں۔ موقع پاتے ہی ہم پھر چل کھڑے ہوں گے۔ میرے دوست تمہاری برساتی پر نئے نئے نشان ہوں گے جن سے نئی یادیں وابستہ ہوں گی۔ دلآویز اور سہانی یادیں یہ ایک تاریک اور جامد وقفہ، لیکن یہ عارضی ہے۔“